اردو ادبیات کا نقیب اور تحقیق و تنقید کا اشاریہ

ماہنامہ

سخندان

کلامِ غالبؔ؛ تعبیر و تجزیہ

ڈاکٹر شہناز مزمل؛ داخلی احساسات کی شاعرہ

تتلیاں آواز دیتی ہیں (افسانہ)

غالبؔ کی غزل میں انسان دوستی

شمارہ نمبر 01 | اردو ادبیات کا نقیب اور تحقیق و تنقید کا اشاریہ | یکم مئی 2021ء

ماہنامہ سخندان

مشمولات

مجلسِ ادارت

سرورق ڈیزائننگ
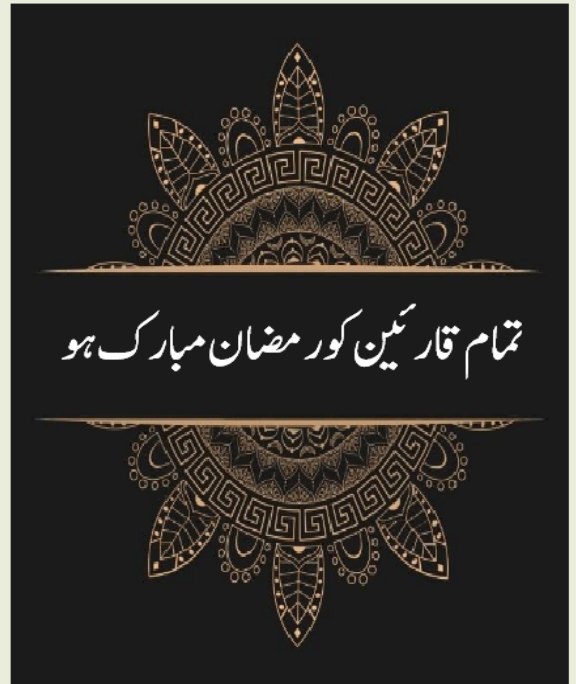
تحقیقی و تجزیاتی مضامین، افسانے، غزلیات، خاکے اور کلام برائے تنقید پیش کرنے کے لیے ان نمبر ز پر وٹس ایپ یونیکوڈ/ڈوکس/ورڈ فائل میں مواد پیش کریں۔ 03035054101 / 03115929589

حمد باری تعالیٰ

کون ہے وہ جو سمندر کو نمک دیتا ہے؟
کون ہے جو دلِ عاشق کو کسک دیتا ہے؟

کون ہے وہ جو ہواؤں میں نشہ گھولتا ہے؟
کون ہے وہ جو پسِ شعر وسخن بولتا ہے؟

کوئی تو ہے جو سرِ کاہکشانِ امکاں
جگمگاتے ہوئے تاروں کی رگیں کاٹتا ہے

کوئی تو ہے جو سرِ کوچۂ عزمِ انساں
روشنی دیتے چراغوں کی لویں کاٹتا ہے

کوئی تو ہے جو تہِ ارضِ خیابانِ امید
لہلہاتے ہوئے پیڑوں کی جڑیں کاٹتا ہے

خالد علوی، انڈیا

نعتِ سید الابرار صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

جب اوجِ سخن کعبۂ توفیق میں خم ہو
تب جا کے تری نعت میں اِک حرف رقم ہو

کیا طرزِ عنایت ہے ترے دستِ سخا کی
اِک بار کریں عرض تو سو بار کرم ہو

جس خاک سے ہے روح کا دیرینہ تعلق
اُس خاک میں اے کاش مری خاک بھی ضم ہو

احساس میں در آئے ترے خواب کی تعبیر
بے صوت رواں دل پہ ترا نقشِ قدم ہو

کیا اوجِ تسلّی پہ ہو وہ منظرِ طلعت
وہ آتے ہوں اور جاتا ہوا آخری دَم ہو

مقصود ! مدینے سے جو آ جائے بُلاوا
واللہ! سرِ راہ گزر بابِ ارم ہو

سید مقصود علی شاہ، برمنگھم انگلینڈ

اداریہ

ناقوس

شائقینِ لوح و قلم! اکیسویں صدی کے پہلے ربع کے نام پر ہم عہدِ برقیاتی ابلاغ اور زمانۂ ابتلائے کرونا میں جی رہے ہیں۔ امید تو یہی ہے کہ اوّل الذکر دور ہی طول پائے گا اور دعا ہے کہ رب العالمین ثانی الذکر آزمائش کو اپنے حکمِ کن سے یک لخت ختم فرمادے۔ ایسے اداسی بھرے ماحول میں کسی برقیاتی مجلّے کا اجرا ہائے تازہ کی سی فرحت دینے کا ضامن ہو سکتا ہے اس سے کم از کم معاشرے کے ادب پسند ارکان کو مثبت طرزِ فکر کی ترغیب تو ملے گی اور حبسِ وبا آلود کی شدت میں قدرے کمی ہونے کا احساس بھی ہوگا۔ اس کارِ خیر کے محرکِ اعلیٰ ایک جوان اور افقِ زبان وادب پر تیزی سے ابھرتے ہوئے غلام مصطفیٰ دائمؔ ہیں جو بجا طور پر ستائش و حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں۔ ان سے اولین تعارف تو معروف ترین ادبی فورم ''انحراف'' پر ہوا اور پھر رفتہ رفتہ یہ ادبی رفاقت گہری ہوتی گئی۔ پہلے انھوں نے اس عالمِ برقستان میں ایک ادبی گروپ ''سخن دان'' کے نام سے تشکیل دیا اور پھر اسی نام سے ایک جریدے کے اجرا کے لیے خاصی مشقت بھری مشاورت کی اور بالآخر یہ خواب تعبیر سے معانقہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

احباب! بیشتر ادبی مجالس، گروپس وغیرہ پر شاعری کا غلبہ ایک مسلمہ حقیقت ہے اور اس کی بڑی وجہ شاید مشاعروں کی عالمگیر مقبولیت ہے۔ محولہ بالا جریدے کی خصوصیت یہ ہے اس میں ارادی طور پر نثری تحریروں کا تناسب زیادہ رکھا گیا ہے اور وہ بھی غیر افسانوی/ نان فکشن اصناف کی شکل میں؛ یعنی تحقیقی و تنقیدی مضامین، گو کہ افسانوی جہت کو یکسر نظر انداز بھی نہیں کیا گیا۔ دراصل اس کی وجوہ پر کچھ مفصل و مدلل توضیح ناگزیر ہے۔ اس میں

کوئی شک نہیں کہ معیاری شعر کہنے کی منزل پانا کوئی سہل کام نہیں لیکن حیرت انگیز طور پر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ عصری ادبی منظر نامے میں کئی نوجوان شعرا بہت تیزی سے ابھر رہے ہیں اور وہ ایسے اشعار کہہ رہے ہیں جو ہر لحاظ سے ندرت، انفرادیت اور جدت کے لبادے میں ملبوس ہوتے ہیں۔ان کی دیکھادیکھی مبتدی شائقین بھی جوشِ سخن کی زبردست تحریک لیتے ہوئے وفور کو معیار پر ترجیح نہ صرف دینے لگے ہیں بلکہ اپنے اس عمل کے دفاع میں بھرپور دلائل سے بھی خود کو لیس کرنے لگے ہیں جو بلاشبہ ایک تشویش ناک امر ہے۔ ایسے میں اصنافِ نثر کا فروغ ناگزیر بھی ہے اور فطری بھی۔ اس میں کوئی شک ہے اور نہ دو آرا کہ جدید نثر میں تحقیق و تنقید کے بڑے نام بآسانی گنے جا سکتے ہیں اور یہ گنتی ختم بھی جلد ہو جاتی ہے۔ کچھ عشرے قبل ڈاکٹر وزیر آغا نے تنقید کے نئے زاویے دریافت کیے اور پھر اسی میدان میں شمس الرحمان فاروقی نے اسپ قلم کو خوب دوڑ آیا۔ جدید ترین دور میں ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے اس شعبے میں اپنا نام فولادی تحریروں سے منوایا۔ تاہم اس پائے کے معدودے ناموں کے اور مشکل سے ہی ملیں گے۔ عزیزم یاسر اقبال نہ صرف اپنے مخصوص اسلوبِ سخن کی بدولت سامنے آرہے ہیں بلکہ مجھے ان کے تنقیدی شعور پر بھی حیرانی ہوتی ہے۔

سو ''سخن دان'' کے اجرا کے اساسی مقاصد میں ایک بڑا مقصد یہی ہے کہ نثر کے اس خاصے او جھل پہلو کو اجاگر کر کے اردو ادب کے دامن کی وسعت سے نئی نسل کو آگاہی دی جائے۔..... اس اولین شمارے کی بابت آپ تمام دوستوں کی آرا ہمارے لیے بیش قیمت سرمائے سے کم نہ ہوں گی۔

مدیر

غالب کی غزل میں انسان دوستی؛ ایک تجزیاتی مطالعہ

محمد یونس ڈار☆

دنیائے ادب کا اصل مرکز و محور انسان ہی ہے۔ انسانی تعلقات کے احساس اور ادراک کا اصل جوہر ادب میں ہی کھلتا ہے۔ فکری لحاظ سے دیکھا جائے تو دو طرح کے رجحانات ہمارے سامنے آجاتے ہیں کہ ایک میں انسان کی مادی ترقی پر زور صرف کیا جاتا رہا ہے اور دوسرے میں اعلیٰ وارفع انسانی اقدار پر زور دیا گیا۔ مطلب یہ ہے کہ انسان اور انسان دوستی کا تصور ہماری تخلیقی روایت کا حصہ روزِ اول سے رہا ہے۔ خاص کر مشرقی سوسائٹی جو ابتدا سے ہی اعلیٰ و ارفع اور تہذیبی و ثقافتی قدروں کی امین رہی ہے، نے بھی ایسے مثبت اقدار کی پشت پناہی کی ہے۔ کیونکہ مشرق شروع سے ہی مذاہب کا آماجگاہ بنا رہا ہے۔ کیا ایک شاعر اپنی سوسائٹی سے الگ ہو کر انسان دوست ہو سکتا ہے؟ کیا اس کے لیے روایت کا پاسدار ہونا ضروری ہے؟ کیا اپنے معاشی اور ثقافتی نظام کا امین ہونا بھی ضروری ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر ایک شاعر روایت کے حصار سے کیسے بلند ہوتا ہے اور اپنے اسلاف اور اخلاف میں اپنی شناخت قائم کر لیتا ہے؟ دراصل بات یہ ہے کہ شاعر کو روایت کا شعور ہونا لازمی ہے تب جاکر وہ تخلیقی اپج کے افتراق واشتراک سے مستفید ہو سکتا ہے۔ چلو مان لیتے ہیں کہ اسلوب سے بھی اس کی شناخت قائم ہوتی ہے۔ کیا صرف اسلوب سے ہی ایک شاعر کی پہچان ہوتی ہے۔ وہ ادبی، سماجی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی صورتِ حال اس کے لئے کیا معنیٰ رکھتی ہے جو ایک شاعر کو شاعر بنانے میں اہم رول ادا کرتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ شاعری انسانی رشتوں کے زوایوں کے لبِ اظہار پر منحصر ہے جس کی پرورش روایت کے بود و باش اور اس کے عنود سے نمود پاتی ہے۔

''گہری انسان دوستی کا تصور ادیب یا آرٹسٹ کی اپنی تخلیقی آزادی کے شعور سے پیدا ہوتا ہے، ایسی صورت میں کہ اس کے دل ودماغ پر کسی جبر کا دباؤنہ ہو۔ وہ اپنے ضمیر کی عدالت میں اپنے آپ کو آزاد محسوس کرے اور اپنی بات کسی مصلحت، کسی خوف، اندیشے یا لالچ کے بغیر کہہ سکے۔ کسی پارٹی لائن یا کسی منظم منصوبہ بند نظریے، کسی ادارے کے احکامات کی بجاآوری اور تخلیقی آزادی کا اظہار ایک ساتھ ہمیشہ ممکن نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ ادیب اپنی

☆ریسرچ سکالر شعبہ اردو، جامعہ کشمیر سری نگر

صلاحیتوں کو، احساسات کو اور اپنے ہر تصور کی طرح انسانی ہمدردی کے تصور کو بھی دوسروں کا مطیع و ماتحت نہ بنادے"۔ [☆]

غالب اردو کی شعری روایت کا پابند بھی تھا اور اس سے آزاد بھی۔ پابند اس لحاظ سے تھا کہ وہ اس مٹتی مغلیہ سلطنت کی ان اقدار کو پھر سے تشکیل (Reconstruct) کرنا چاہتا تھا جن کی مرکزیت ایک عرصہ کو محیط تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری ہمیں انسان دوستی کے ان تمام ارفع اقدار کی تلقین کرتی ہے جن کی روایت ہمارے یہاں تصوف میں پیوست ہے اور آزاد اس لیے تھا کہ مغلیہ سلطنت کا شیزازہ بکھرنے سے جو تہذیبی زوال ہندوستان میں شروع ہو چکا تھا وہ مغل سلطنت جس کے جاہ و جلال اور جس کی شان و شوکت نے ہندوستان کو سیاسی، سماجی اور معاشی لحاظ سے استحکام بخشا تھا، غالب کی آنکھوں کے سامنے مٹ رہی تھی۔ پرانی اقدار کے بجائے نئی اقدار، نئے پیمانے، نئے قرینے اور نئے تہذیبی سانچے وڈھانچے وضع ہو رہے تھے۔ ان سے بھی غالب جیسا حساس فنکار کیسے اپنی نظریں چرا سکتا تھا؟ یہی وجہ ہے کہ تخلیقی سطح پر غالب کے یہاں ہمیں ایک طرح کی ناہمواریت، شورانگیزیت، کشمکش اور تشکیک پسندی نظر آتی ہے۔ بنابریں وہ ہر اس روایتی قدر کو اسی نظر سے دیکھتے ہیں جس کے قدم اس طوفانِ بدتمیزی اور انحطاط کے دلدل میں لڑکھڑا گئے تھے۔ خدا، انسان، کائنات، تصوف، حسن، عشق سب کو وہ اسی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان پر سوالیہ نشان لگا دیتے ہیں اور پھر ایسا لگتا ہے کہ ہماری کلاسیکی شاعری سوچ وبچار کی جس شعریات کو اختراع کر چکی تھی، غالب اس کی بھی نفی کرتے ہیں۔ بلکہ ایسا کہنا چاہیے کہ وہ روایتی اصول وضوابط کو یکسر مسترد تو نہیں کر دیتے ہیں لیکن اپنے لیے ایک نئی شعریات کو وضع کرتے ہیں۔ عشق جو ہماری کلاسیکی شاعری کا بنیادی موضوع رہا ہے. یا یوں کہیے کہ غزل کا خمیر ہی عشق سے بنتا ہے جہاں مجاز کے پیمانے میں حقیقت کا پرتو دیکھا جاتا تھا۔ غالب تک آتے آتے اس کی حیثیت دماغ کے خلل سے زیادہ نہیں رہتی۔

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل　　کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

بقول وزیر آغا:

"غالب کا رویہ تجربے سے کشید ہوا ہے اور اس کی زندگی کے عام پیٹرن کے عین مطابق ہے۔ غالب کا اسلوبِ حیات ہی نہیں، اس کا زاویۂ نگاہ نیز حیات اور اس کے متبرک اداروں، انسان اور اس کے سنجیدہ وظائف پر ایک آنکھ میچ کر تبصرہ کرنا اور اس ضمن میں شاعرانہ مزاح کو بروئے کار لانا۔۔۔۔۔۔ اس سب نے غالب کو اپنے زمانے کے جمِ غفیر میں ایک ایسے فرد یا Individual کا درجہ دے دیا ہے جس کا اسلوبِ شعر اور اسلوبِ خیال نہیں، اسلوبِ حیات بھی لوگوں کے لئے اجنبی اور نامانوس ہے۔ غالب کو اس کے اپنے زمانے میں جس بے رحمی سے مذاق اور دشنام کا نشانہ

☆ شمیم حنفی، مضمون "ادب میں انسان دوستی کا تصور"، مشمولہ "اردو ادب کی موت" مرتبہ طاہر مسعود لاہور سنگ میل پبلی کیشنز 2015ء، صفحہ نمبر 678

بنایا گیا وہ اس کی انفرادیت ہی کے باعث تھا جسے اس کا زمانہ قبول کرنے بلکہ سمجھنے تک سے قاصر رہا''۔ [☆]

تضاد، ٹکراؤ اور کشمکش کے اسی پہلو سے غالب کی غزل انسان دوستی کے اقدار کی نقیب اور ترجمان بن جاتی ہے۔ گو کہ غالب صوفی شاعر نہیں تھے لیکن فارسی شعری روایت اور ابن العربی، فضلِ حق خیر آبادی اور الٰہی بخش معروف سے متاثر رہے ہیں اور وحدت الوجود کے ماننے والے تھے تو وہ انسان کو اللہ تعالیٰ کے پرتو کا مظہر سمجھتا تھا۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا　　یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا

چنانچہ انسان کسی بھی دوسرے سے کم ہے اور نہ زیادہ بلکہ سب انسان برابر ہیں۔ اس طرح غرور، تکبر، گھمنڈ کے ان منفی رجحانات کی نفی ہوتی ہے جن سے ایک انسان خود کو دوسرے انسانوں سے بڑا اور قابل سمجھتا ہے۔ غالب ہر جگہ اس تفریق کے منکر نظر آتے ہیں۔ اس کے بالعکس غالب وفاداری کی شرط کو ایمان کا اصل جوہر تصور کرتے ہیں۔ ''وہ انسان کے لیے وفاداری کی خوبی کو لازم قرار دیتے ہیں۔ وفاداری کے بغیر انسان کچھ نہیں، یہ وفاداری انسان سے ہو، قومیت سے ہو، دین دھرم سے ہو یا مذہب سے، لیکن بھرپور ہو، اس میں کوئی جھول نہ ہو۔ وفاداری کے لیے صرف استواری ہی کو وہ شرط قرار دیتے ہیں''۔ [☆☆]

وفاداری بشرطِ استواری، اصلِ ایماں ہے　　مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

انسان دوستی کی یہ روایت غالب کے خطوط میں بھی جا بجا ملتی ہے۔ غالب بلا امتیازِ رنگ و نسل، مذہب و زبان کے ہر انسان کو خدا کا بندہ اور اپنا بھائی تصور کرتا ہے۔ ایک خط میں اپنے ایک ہندو شاگرد مرزا ہرگوپال تفتہ کو ان الفاظ میں مخاطب کرتے ہیں: ''بندہ پرور! میں تو بنی نوع آدم کو مسلمان ہو یا ہندو یا نصرانی، عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں دوسرا مانے یا نہ مانے''۔ [☆☆☆]

غالب حیات کی محرومیوں اور پیچیدگیوں کے بل بوتے ہی انسان اور انسانی زندگی کے اسرار و رموز کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ زندگی سے حاصل شدہ تلخ تجربات کو اپنی شخصیت کی توانائی، نئے فکری میلانات اور فنی شعور سے انسانی زندگی کے زیر و بم کی شناخت کرتے ہیں تاکہ تازہ کاری، گہرائی اور غور فکر سے ایسے نئے زاویے نمود پذیر ہوں جن میں انفرادیت کے باوجود آفاقیت اور مقامیت کی برجستگی بھی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں غالب کے انفرادی تجربات میں اجتماعیت کی بو باس محسوس ہوتی ہے جو تصوف اور اخلاقی عناصرِ حیات کی آمیزش سے مملو بھی ہے جس کا سب سے بڑا نقش ان کی رواداری ہے اور جس کا اصل منبع تخلیقی پختگی کو اس مقام سے ملتا ہے جہاں سے انسانیت کی معراج شروع ہوتی ہے۔ ''غالب کا سب سے اعلیٰ شاعرانہ استعارہ، جو ان کے تخیل کی تخلیق اور ان کے کلام کا خالق

☆ وزیر آغا، مضمون ''غالب اور تصوف کی روایت''، مطبوعہ آجکل، دہلی، اکتوبر 1996، جلد 55، شمارہ 03

☆☆ کامل قریشی، ڈاکٹر، مضمون؛ 'غالب کا مثالی انسان'، مطبوعہ غالب نامہ، دہلی، جولائی 1987ء

☆☆☆ خطوط غالبِ، مرتبہ؛ خلیق انجم، ڈاکٹر، صفحہ نمبر 318

بھی ہے، انسان ہے۔ اور وہ بیشتر اپنی انسانیت کی گوناں گوں کیفیتوں میں محو نظر آتے ہیں۔ انسان وہ مقام ہے جہاں سے ان کے تصورات اور ان کی آرزؤں کے قافلے روانہ ہوتے ہیں اور ساری بادیہ پیمائی اور دریا کشی کے بعد پھر اسی مقام پر واپس آجاتے ہیں''۔ [☆]

آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل　　　ہر گز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

یونہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب ورنہ کہنا　　　کہ مرے عدو کو یارب ملے میری زندگانی

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہو گا　　　اور درویش کی صدا کیا ہے

نہ سنو گر برا کہے کوئی　　　نہ کہو گر برا کرے کوئی

روک لو گر غلط چلے کوئی　　　بخش دو گر خطا کرے کوئی

اوپر بالا اشعار سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شاعر انسان کے گنہ گار اور خطا کار ہونے میں یقین رکھتا ہے۔ مگر ضروری ہے کہ خطا کا جواب خطا سے نہ دیا جائے بلکہ اصلاح سے انسان سازی کا کام انجام دیا جاسکتا ہے جو بعد میں مہذب معاشرہ کی تشکیل میں معاون مددگار ہو سکتی ہے۔ غالب ہجوم فکر اور تہذیبی و ثقافتی پیٹرن کے انحطاط میں بھی متجسس رویہ اختیار کرتے ہیں کہ تمام تر کمزوریوں، محرومیوں، ناکامیوں اور شکست و ریخت کے باوجود بھی اسے اسی انسان میں کشش نظر آتی ہے۔ وہ انسان کے اس رویہ سے نالاں ہے جس میں کٹر پسندی، ملائیت، اجارہ داری، حرص و ہوس، لالچ اور بے ایمانی کے اجزا شامل ہوں۔ وہ غموں سے بالکل بھی گھبراتے نہیں بلکہ ان کو انسان کی بناوٹ میں مثبت تصور کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ غالب کو انسان ذات پر مکمل ایمان ہے کہ وہ تسخیرِ کائنات بھی کر سکتا ہے۔ یونہی تدبیر کائنات بھی اور تعمیرِ کائنات بھی۔ اس سب کے پسِ پشت غالب کا وہ دردمند دل کارفرما ہے کہ جس کی تعمیر و تشکیل میں وہ تمام تہذیبی و تمدنی اثرات شامل ہیں جن کی تربیت شاعر کو محبت و ہمدردی اور رواداری کے ایک ایسے اعلیٰ و ارفع مقام پر فائز کرتی ہے جہاں مضامینِ غیب سے ہی سہی مگر پیغمبری قلم سے ہوتی ہے۔

رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج　　　مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا　　　آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

آدمی محنتوں سے ہی انسان بنتا ہے اب جب کہ اسے تمام تر سہولیات بہ آسانی مل جاتی ہیں اور کوئی محنت نہ کرنا پڑے پھر نہ تو اسے حقیقت سمجھ آئے گی اور نہ ہی اصلیت۔ کیونکہ محنت انسانیت کو دامِ دوراں کے اصول اور محبت کے ایجاد و امکان سکھا دیتی ہے۔ ہاں بر سرِ پیکار ایجاب میں لذتِ کوشاں کا یہی وہ رویہ ہے کہ جس کی کامرانی اجابت کے اقدامات کرتی ہے اور حسن و صداقت کی نقیب بن کر پیکرِ پریشان میں غم و نشاط سے اپنا حال و قال ملا کر تماشا اور

☆غالب - اردو کلام کا انتخاب، محمد مجیب، دہلی؛ مکتبہ جامعہ لمٹیڈ 1969، صفحہ نمبر 39

شوق کے سنگ اپنا سفر طے کرتی ہے۔ معلوم سے لامعلوم تک، مکان سے لامکان تک اور تشکیک سے حقیقت تک کا یہ سفر رمز و ایما کی اس زبان میں کھلتا ہے جسے ہم غالب کی غزل کہتے ہیں۔ یہی وہ غزل ہے جو اردو غزل کی معراج ہے کہ جس کی شریعت بھی مکمل ہے اور طریقت بھی۔ جس کا ایک ایک حرف معتبر بھی ہے اور مدلل بھی۔ جو مسلسل عظمتِ آدم کا احساس دلاتی ہے کہ گردشِ دوراں سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ جینے کا ایسا سلیقہ اپنانا چاہیے کہ لاکھ طوفان میں بھی انسان کا حوصلہ کم نہ ہونے پائے۔ اس کی ہمت اور بڑھنی چاہیے۔ ہاں! شاعر کو یہ احساس ہے کہ ہستی بالآخر روبہ زوال ہے لیکن اس دنیا میں انسان کی اہمیت اس شمع کی طرح ہے جس کی عمر بس ایک رات ہوتی ہے۔ اس کے باوجود بھی سحر تک جل کر وہ اپنے حصے کا حق ادا کرتی ہے۔ یہی مثال انسان کی ہے کہ جب تک دنیا میں اپنے فرضِ منصبی سے منہ نہ موڑے بلکہ ہنسی خوشی راضی ہو کر زندگی کو گلزار بنائے۔

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام   مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگزارِ بادیاں

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی، غافل   گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

لیکن پھر بھی شاعر انسان کی عظمت سے متنفر نہیں ہے بلکہ اپنی رمز شناش غزل سے بار بار اس بات کی تلقین کرتے ہیں کہ اس کائنات میں انسان ہی سب کچھ ہے جس کے ہونے سے کائنات اور خالقِ کائنات کا انکشاف ہوا ہے۔ نیز انسان فطری آزادی میں ہی وہ مقام اور مرتبہ حاصل کر سکتا ہے جس کا وہ خواہاں اور متمنی ہے۔ کیونکہ مسلسل جدوجہد اور عمل کا پیکر بن کر ہی وہ بقائے دوام حاصل کر سکتا ہے جس سے انسانیت اس عظیم المرتبت مقام پر پہنچ سکتی ہے جہاں کی تمنا انسان کو فرشتے سے بھی عظیم تر بنا دیتی ہے اور انسان میں یکسانیت و مساوات، ہم آہنگی، رواداری اور باہمی تعاون جیسے مثبت اور صالح عناصر کی نمود ہوتی ہے۔ غرض ''ان کی فکر کا مرکزی نقطہ شوق، تمنا، جستجو اور خوب سے خوب تر کی تلاش ہے تاکہ انسان اپنے لامحدود امکانات کی کھوج میں ذہنی اور روحانی بلندیوں پر پہنچ کر اپنا صحیح مقام پالے۔ ان کا مسلکِ انسانیت، انکی آزادہ روی اور وسیع المشربی انسانیت کا ہمہ گیر شعور، حیات و کائنات کا وسیع تر اور انکی تقلید دشمنی اپنی مثال آپ ہے''۔ [☆]

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے   لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

کرتے ہو مجھ کو منعِ قدم بوس کس لیے   کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

غالب کا عہد سامراجی جکڑ بندیوں میں پے در پے شکست و ریخت سے چور چور ہو رہا تھا۔ چہار دانگ زندگی کی بے بسی شاعر کے دلِ گداختہ کو بے چین کیے دیتی تھی۔ چنانچہ عوام بھی اپنے قومی ورثہ سے محروم ہوتی جا رہی تھی۔ عزل و نصب کی اس باگ دوڑ میں وہ تہذیبی اور ثقافتی قدریں بھی یتیم ہو رہی تھیں جو کسی زمانے میں پھل پھول رہی

☆اشفاق حسین - ''اقبال اور انسان''، حیدر آباد: آندھرا پردیش ساہتیہ اکادمی، اپریل 1974ء، صفحہ نمبر 35

تھیں۔ اس قومی تنزل سے غالب گو کہ اپنی قوم کو نکال نہیں سکتے لیکن اس پر افسوس ضرور کر رہے ہیں اور تخلیقی تاثیریت سے بھر پور اپنے نالے یوں اگلتے ہیں:

ضعف سے ہے نے قناعت سے یہ ترکِ جستجو ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم
شہادت تھی مری قسمت میں جو دی تھی یہ خو مجھ کو جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو

اس قومی بے حسی کے جو بھی محرکات رہے ہوں لیکن یہ ضرور تھا کہ استعمار اتنا مکار اور شاطر تھا کہ اس نے لوگوں میں بے عملی اور کم ہمتی کے ایسے عناصر کو فروغ دیا تھا کہ وہ ہر قسم کی جد وجہد سے دوری میں ہی اپنی عافیت محسوس کرتے تھے۔ علم و عمل کے اس فقدان میں قومیں ہمیشہ بحران کی شکار رہی ہیں اور ان کی شناخت اجنبیت کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک کہ وہ اپنے ضمیر کو علم و عمل کی روشنی سے منور نہیں کرتی، آزاد نہیں ہوتیں۔ شاعر کے عہد میں بھی ہندوستانیوں کا یہی رویہ تھا۔ وہ جدید تعلیم کو نہ صرف حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے بلکہ اسے کفر و الحاد کی حد تک تصور کرتے تھے۔ بنا بریں انہیں سامراج کے ہر ہاں میں ہاں ملانا پڑتا ہے۔ لیکن بیدار ضمیر شاعر اس صورتحال سے مضطرب و پریشان ہو رہا ہے کہ اپنی قوم کو اس آمیز زندگی سے کیسے نجات مل سکتی ہے؟

بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پاؤں
مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پاؤں

قوم کی اس ماضی پرستی اور زبوں حالی سے شاعر ایک ایسی جگہ رہنے کا متمنی ہے جہاں دنیا و مافیہا کا یہ شور غل نہ ہو۔ دوستی داری اور انسان دوستی کی یہ جگہ ایسی ہونی چاہیے کہ جہاں ہمسائیوں کے درمیان کوئی دیوار کھڑی نہ ہو کہ کوئی ہمسایہ کہلائے بلکہ وہاں سب مل جل کر ایک ساتھ رہتے ہوں۔ اگر کبھی کوئی انسان کسی بھی درد میں مبتلا ہو جائے تو وہ سب کے لئے دردِ مشترک ہونا چاہیے نیز اگر کوئی مر جائے تو سب نوحہ خواں بن جانے چاہیے۔

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

غالب اس زبوں بختی کے دور میں انسانی رشتوں کی تمام پیچیدگیوں کو بہ زبانِ قلم بیش از پیش رقم کرتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ اپنے عائلی رشتوں ناتوں کے درد و کسک کو بھی موزوں کرتے ہیں۔ جس کی عمدہ مثال ان کی مغموم لے میں ڈوبی وہ غزلِ مسلسل ہے جو انہوں نے اپنی بیوی کے بھانجے عارف کی وفات پر کہی تھی۔ غالب کی یہ رثائی نوعیت کی غزل اس بات کی شاہد ہے کہ وہ عصری ساعت سے کس حد تک واقف تھے جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے کہ یہ وہ دور تھا جب روایتی قدروں کی جگہ نئی قدریں اپنے لیے جگہ بنا رہی تھیں اور متداول نظامِ معاشرت میں انسانی رشتے بھی خود غرضی اور نفسا نفسی کی دوڑ میں پیش پیش تھے۔ مذکورہ غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم ماہ شب چار دہم تھے مرے گھر کے پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور

غالب کی انسان دوستی مابعد الطبعی حوالوں سے متبادر ہوتی ہے جس میں عزتِ نفس کے ساتھ ساتھ شاعر کے عہدِ الم کی مرقع سازی بھی شامل ہے۔ جو عشق کے جوہرِ تابدار سے خوشگوار بھی ہے اور رونق افروز بھی۔ جس کے جلوہ ہائے ناز میں انسانی نفسیات کے آب و تاب کی چمک بھی ہے اور رمق بھی۔ اس میں انسانی رشتوں کی پاسداری بھی ہے اور احساسِ مروت کی پاکدامنی بھی۔ سوز و گداز کی لے بھی ہے اور بے نیازی کی نے نوازی بھی۔ آفاقیت بھی ہے اور رفعتِ تخیل بھی۔ ندرتِ افکار بھی ہے اور معنی داریت بھی۔ حقیقت نگاری بھی اور جذبات نگاری بھی اور تو ور نشاطِ غم بھی ہے اور شوخی و ظرافت بھی۔

غرض! غالب انسان کو فرشتہ نہیں بلکہ انسان ہی دیکھنا چاہتا ہے جو اپنی تمام تر کمزوریوں اور محرومیوں کے باوجود کائنات کی وسعتوں اور گہرائیوں کا ادراک رکھتا ہے۔ اپنی حقیقتِ حیات کی گھما گھمی اور انگیزی کے باوجود بھی صداقت کی تلاش میں سرگرداں ہے کہ اپنے من کی موج کا کسی بھی قیمت پر وہ نو آباد کار سے سودا کرنے کو تیار نہیں ہے بلکہ سنگین حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کو راضی ہے۔ ساتھ ہی مصائب و آلام کی آزمائشوں میں ایک دوسرے کا ساتھ دینے کے لیے بھی تیار ہے۔ لیکن گندی نالی کے کیڑے مکوڑوں کی طرح پستی کی زندگی گزارنا کسی بھی قیمت پر قبول نہیں کرتا ہے۔

جلیل عالی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں :

''کلامِ غالب کی درست تفہیم اور اس کی فنی جمالیاتی تحسین کے لیے اپنی فکری و تہذیبی روایات کے اعماق ہی سے رجوع کرنا پڑے گا۔ اوپر سے ٹھونسی ہوئی کسی محدود، ادھوری اور باہری ادبی تھیوری کی محاکمہ کاری سے نہ تو اس کی تخلیقی واردات کی حقیقی تفہیم ممکن ہوگی اور نہ ہی اس کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکے گا۔ کیوں کہ غالبؔ بہت سے تشکیکی سوالات اٹھانے کے باوجود اپنی فکری تہذیبی روایت کے کلی تصورِ حقیقت سے باہر نہیں نکلتا اور اس کی تکذیب کا مرتکب نہیں ہوتا''۔

(شعری دانش کی دنیا میں۔ جلیل عالی۔ صفحہ 134)

بہار سے تغارچوں کو پِیلنا پڑا مجھے
نراس شہر آس پر فَصیلنا پڑا مجھے

یمین اور یسار کاٹتے تھے نیند میں جسے
تو اس درخت کو دعا سے کِیلنا پڑا مجھے

ببول زرد موسموں کے جب ہرے سے ہو گئے
خدا کے فیصلے کو بھی دَلیلنا پڑا مجھے

سفیر زندگی کے جب چراغ سب بجھا گئے
نئے سرے سے شہر کو قَبیلنا پڑا مجھے

سمجھ رہے تھے چیخ کو بھی سامعین نغمگی
سو ڈھولکی کی تھاپ کو ہی نِیلنا پڑا مجھے

رائے علی اسجد

ہست و نمود و بود سے آگے کی چیز ہوں
میں عشق ہوں، وجود سے آگے کی چیز ہوں

میں واقفِ تلذذِ صد انتظار ہوں
اور حرصِ دیر و زود سے آگے کی چیز ہوں

اک شوق ہوں طلب سے ورا، خود غرض مرے
سر مستی و سرود سے آگے کی چیز ہوں

ملہم ہی جانتے ہیں مرا وقتِ آشکار
میں آمد و ورود سے آگے کی چیز ہوں

تو ظاہری نگاہ سے تکتا ہے کیا مجھے
میں شاہد و شہود سے آگے کی چیز ہوں

ہوں ماورائے شعر و شعورِ فہام دوست
یعنی میں ان حدود سے آگے کی چیز ہوں

اچھا برا کھپت پہ مری منحصر ہے سب
مثلِ شرر ہوں، زود سے آگے کی چیز ہوں

مہلک مثالِ زہرِ دلِ کینہ ساز ہوں
اور جسم میں غدود سے آگے کی چیز ہوں

آزاد حسین آزاد

کلامِ غالب؛ تعبیر و تجزیہ

غلام مصطفیٰ دائم

غالبؔ ہندوستان کا وہ عظیم شاعر ہے جو فکر و وجدان کے تخلیقی عمل میں تمام تر معنویت اور جمالیاتی قضایا کو یوں سمو دیتا ہے کہ اس کے خامۂ اعجاز سے معنیٰ آفرینی کے سوتے پھوٹ پڑتے ہیں۔ وہ لفظوں کو ان کے عام منہج سے بلند کر کے علامتی اور تمثیلی سطح پہ یوں باندھتا ہے کہ فن پارہ اس کا منشا نہیں عمل بن جاتا ہے۔

شعر کی زبان ہمیشہ اختصاری مزاج رکھتی ہے۔ کنایہ اس کا جوہر اور تہ داری اس کا لہجہ ہے۔ شعر میں برتا گیا ہر لفظ اپنی منطقی ضرورتوں کے حوالے سے خود مکتفی ہو تو تخیلاتی پرتیں اپنے اعلیٰ مظاہر میں متشکل ہوتے حشوِ کلام کی محتاج نہیں ہوتیں۔

میں نے کلامِ غالبؔ کا مطالعہ کرنے کے لیے تقابلی طریقہ اختیار کیا ہے۔ کیوں کہ یہی وہ وسیلہ ہے جس سے شاعر کا تخلیقی اسلوب، فن پارے کا معیار، فنّی لوازم کا عمل اور جمالیاتی بناوٹ کا مرتبہ معلوم ہوتا ہے اور بعض امور میں اس کے تفرّدِ شاعرانہ سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ مشرقی و مغربی شعریات کی روشنی میں کلامِ غالبؔ کی تفہیم کا سلسلہ اگرچہ حالیؔ نے شروع کیا تھا لیکن باضابطہ اور جامع پیرائے میں اس کام کا سہرا شمس الرحمٰن فاروقی مرحوم کے سر ہے۔ لہٰذا میرے طریقۂ شرح میں مغربی Poetics کا شعوری اخذ و استنباط ایک خوبی کے طور پر ہوگا۔

میں نے "کلامِ غالبؔ- تعبیر و تجزیہ" کے ضمن میں ان مقاصد کو اپنا مطمعِ نظر رکھا ہے:

☆ شعر میں کارفرما معنوی اور فنی تشکیل کے عمل کو سامنے لایا جائے۔ کیونکہ تفہیم کا کام بس اتنا نہیں کہ کسی شعر کو یک سطری بیان بنا کر پیش کر دیا جائے یا اس کی نثر کر کے طالب علموں کو فراہم کر دی جائے۔ شارح کی ذمہ داری ہے کہ شعر میں کھلنے اور پھیلنے کی جتنی گنجائش پوشیدہ ہے، اسے عمل میں لا کر دکھائے۔ تاکہ پڑھنے والا شعری مفاہیم کی جمالیاتی بناوٹ سے واقف ہو جائے اور اس شعر کا تخلیقی مرتبہ بھی پہچان لے۔

☆ شعر میں موجود معنوی تنوعات کا احاطہ کیا جائے اور معانی کی درجہ بندی کر کے ان میں ایک ترجیح قائم کی جائے تاکہ مرادات کی کثرت انتشار کو مستلزم نہ ہو۔ نیز تشریح کی بجائے تعبیر سے کام لیا جائے۔

☆ مختلف الدرجات معانی کا تعین اور ان کے مابین فنی اور تخلیقی ربط کو دریافت کیا جائے اور فرانس کے

رولاں بارتھ (RolandBarthes) کے اس خیال ’’متن کی تفہیم اور توضیح صرف قاری سے منسلک ہے اس عمل میں مصنف کا سرے سے کوئی کردار ہی نہیں‘‘ سے قطعِ نظر متن فہمی کے عمل میں منشاے مصنف کو بھی حسبِ ضرورت اہمیت دی جائے۔(منشاوہ تہذیبی عنصر ہے جو عصری تلازمے کے اثرات قبول کر کے مخصوص پیش منظر کا حامل بنتا ہے۔ لیکن چونکہ متن تخلیق کرنے والے کا اپنا تخلیقی زور اور فکری عمل خود شریکِ عمل ہوتا ہے، اس لیے متن میں مصنف کا عندیہ کلیتاً جھٹلایا نہیں جاسکتا بلکہ اس کی اہمیت مسلّمہ ہے۔)

☆ وہ الفاظ جن کی حیثیت علامتی ہو، انھیں پیشِ نظر رکھا جائے تاکہ معنویتِ شعر کا جمالیاتی جوہر گرفت میں آئے۔

☆ شعر کے فنی در وبست پہ معترضین کے بیجا اعتراضات کا جائزہ لیا جائے اور اس کی نوعیت اور موضوعیت پر ممکنہ فیصلے صادر کیے جائیں۔

☆ تجزیاتی و تقابلی طریقہ کار سے اشعارِ غالبؔ کا جائزہ لیا جائے تاکہ غالبؔ کے تخئیلی و تشکیلی مرتبے کی اونچ نیچ کا تخمینہ لگایا جاسکے۔

☆ عموماً یہ کوشش رہی ہے کہ کلامِ غالبؔ کی شرح کے لیے سادہ اسلوب اختیار کیا جائے تاکہ اس سے بالخصوص طالب علم اور بالعموم نیم خواندہ طبقہ فیض یاب ہو سکے لیکن جہاں ضرورت محسوس کی وہاں عالمانہ طرزِ شرح بھی اپنائی ہے تاکہ مقامِ شعر اور روحِ غالبؔ دونوں کی حرمت مجروح نہ ہو۔

☆ وہ الفاظ جو معانیٔ لطیفہ یا تاویلیہ کے حامل ہوں، ان کی تہ میں کارفرما تخلیقی جوہر کا پتہ لگایا جائے۔ نیز بین المصرعین تناسب و تلازم کی نشاندہی کی جائے، خواہ وہ صراحتہً مذکور ہو یا کنایتہً، ضمناً ہو یا دلالتہً۔

☆ مطلبِ شعر حل کرنے کے بعد اس میں پنہاں نکات، فوائد اور لطائف کو بیان کیا جائے۔ نیز الفاظ کی لغوی حیثیت سے بھی حسبِ ضرورت بحث کی جائے۔

☆ شبہاتِ ظاہر الورود کو رفع کیا جائے۔ مثلاً بعض اشعار سے متعلق سرقہ کا الزام ہے، حال آنکہ وہ اس زمرے میں نہیں آتے، ایسے اشعار سے الزامِ سرقہ اٹھا کر حقیقتِ حال واضح کی جائے۔

یوں تو کلامِ غالبؔ کی درجنوں شروح لکھی جا چکی ہیں لیکن اب تک کوئی ایسی شرح نہیں آئی جس میں مندرجہ بالا تمام مقاصد کی روشنی میں اشعارِ غالبؔ کو حل کیا گیا ہو۔ پس یہی مقاصد ایک نئی شرح کا جواز بلکہ وجوب ثابت ہوتے ہیں۔

کلامِ غالبؔ کی شرح کے سلسلے میں سابقہ شروح سے استفادہ میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔ درجِ ذیل شارحین کی شرحیں میرے پیشِ نظر رہی ہیں:

خواجہ الطاف حسین حالی، مولوی عبد العلی والہؔ حیدر آبادی، محمد عبد الواجد واجدؔ دکنی، درگا پرشاد نادرؔ، سید علی حیدر نظمؔ طباطبائی، سیّد آل حسین شاداںؔ بلگرامی، فضل الحسن حسرتؔ موہانی، پنڈت لبھو رام جوشؔ ملسیانی، پروفیسر یوسف سلیم چشتی، ڈاکٹر سید عبداللہ، مولانا عبد الباری آسیؔ، نندلال کول طالبؔ کاشمیری، مولانا ناطقؔ گلاؤٹھوی،

سید وحید الدین بیخودؔ دہلوی، بیخودؔ موہانی، شہاب الدین مصطفیٰ، آغا محمد باقر، ناصر الدین ناصرؔ، نظام الدین حسین نظامی بدایونی، قاضی خلیل الرحمان بینا بجنوری، علامہ نیاز فتح پوری، مولانا غلام رسول مہرؔ، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، منظور احسن عباسی، پرتورؔ روہیلہ، مولانا ممتاز احمد سہاؔ مجددی بلند شہری، جعفر علی خان اثرؔ لکھنوی، وجاہت علی سندیلوی، قاضی سعید الدین احمد علیگ، شمس الرحمان فاروقی، پروفیسر ملک عنایت اللہ، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

ان کے علاوہ غالبؔ شناسوں کی سیکڑوں کتب اور ہزاروں مضامین میرے مطالعے میں ہیں۔ ان سے حسبِ ضرورت استفادہ کرتا ہوں اور جس نکتے کو مفید جانتا ہوں، باحوالہ نقل کرتا ہوں۔ تقابلی و تجزیاتی طریقہ کار میں قدیم و جدید شعرا کے کلام ہائے اردو و فارسی سے بھی موقع محل کی مناسبت سے اشعار پیش کرتا ہوں۔ بطورِ سند ہو یا مضمونِ شعر کی ہم آہنگی کے طور پر۔ نقلِ اشعار کے بعد محاکمہ قائم کرتا ہوں اور ترجیحی بنیادوں پر غالبؔ کی انفرادیت کا تعین کرتا ہوں۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ متنِ شعر میں کسی مقام پر اغلاق کا اندیشہ ہو تو اس کی ماہیت، لغتہً، تقسیماً، تصریفاً اور ترکیباً تحقیق کرتا ہوں۔ اس سلسلے میں بعض اوقات اشہبِ خامہ کی سمت بدل ضرور جاتی ہے لیکن مقصود بہر حال تفہیم و تعبیرِ شعر ہی ہوتا ہے اس لیے اسے بھی گوارا کر لیا جاتا ہے۔

⊛⊛⊛⊛⊛⊛⊛⊛

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخؔ
”آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں“

اعتقاد : کسی خاص سمت قلبی رجحان۔ اردو میں مطلق عقیدت کے معنیٰ میں زیادہ مستعمل ہے۔ مرزا غالب، ناسخؔ کے اس رسمی اعتراف کو تسلیم شدہ عقیدے کے درجے پہ فائز سمجھتے تھے اور یہی عمل اس دعویٰ کے لیے بطورِ دلیل کافی ہے کہ غالبؔ، میرؔ سے بیش قدر متاثر تھے۔

بے بہرہ : وہ شخص جو کسی سے فائدہ کش ہونے کی استطاعت نہ رکھتا ہو یا اس کی بے اعتقادی اس میں مانع ہو۔

جو معتقدِ میر نہیں، یعنی :

جو میرؔ کی شعریت سے بے فیض ہے۔

جو میرؔ کو بڑا شاعر یقین نہیں کرتا۔

جو مکتسبِ میرؔ نہیں۔ [☆]

☆ وجہ یہ ہے کہ وہ خدا کے سوا ایک انسان کی جھوٹی بندگی کا دعویٰ ہتکِ حرمت کے مترادف محسوس کرتے تھے۔ لیکن حالات کی چیرہ دستیوں اور وقت کے جبر نے انھیں یہ بھی کرنے پہ مجبور کیا۔ ان کی طبیعت اس پہ ہمیشہ منفعل ہی رہی۔ نیز ان کا احساسِ برتری بھی اس میں مانع تھا۔ شاید وہ طبعاً قصیدہ کہنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ میرؔ کی قصیدہ گوئی سے متعلق تقریباً اکثر (بقیہ اگلے صفحے پر)

جو میرؔ کی استادی کا قائل نہیں۔
جو میرؔ سے عقیدت نہیں رکھتا۔
جو میرؔ کے پایۂ سخن کا معترف نہیں۔

زیرِ بحث شعر میں غالبؔ نے ناسخؔ کے اس عقیدہ پہ جزم واطمینان کا اظہار کیا ہے کہ جو میرؔ کی عظمت کا قائل نہیں، وہ بہرۂ سخن سے تہی دامن ہے۔ ناسخؔ کا شعر :

آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں		معترف کون نہیں میرؔ کی استادی کا

ناسخؔ کے مصرع پہ غالبؔ نے پہلے یہ گرہ باندھی : ریختے کا وہ ظہوری ہے بقولِ ناسخؔ

اس مصرع کو اصلاح کے بعد موجودہ شکل میں بدلا۔ وجوہِ ترمیم دو ہیں :

1۔ ''بقولِ ناسخؔ'' سے یہ شبہ پیدا تھا کہ ''ریختے کا وہ ظہوری ہے'' بھی ناسخؔ کا بیان ہے، حالانکہ ایسا نہیں۔ طباطبائی نے بھی یہی وجہ لکھی ہے :

''اس بندش میں یہ اشتباہ ہوتا ہے کہ ناسخؔ کا یہ قول ہے کہ میر ریختہ کا ظہوری ہے'' [☆]

2۔ ظہوری یوں تو ہر صنفِ سخن میں طبع آزما ہوئے لیکن مثنوی خاص اُن کا میدان تھا۔ نیز لفظی صنّاعی میں بھی ماہر۔ نثر میں صنعت آرائی اُن کا خاص وطیرہ تھا۔ صاحبِ خزانۂ عامرہ نے اُن کی نثر پہ جاندار تبصرہ کیا ہے۔ قصیدہ گوئی میں بھی خاص رنگ کے موجد تھے۔ چونکہ میرؔ کی طبیعت لفظی صنّاعی کی طرف میلان نہیں رکھتی تھی اور نہ وہ قصیدہ گوئی میں مروّج تقاضوں کے مطابق لفظی طمطراق وصنعی طنطنہ کی بجاآوری کرتے تھے۔ [☆☆] اسی لیے غالبؔ نے ان سب کے پیشِ نظر مصرع میں ترمیم ضروری سمجھی۔

(گزشتہ سے پیوستہ) ناقدین متفق ہیں کہ وہ اپنی قصیدہ گوئی میں ممدوح کی تعریف کے علاوہ واسوخت بھی لے آتے ہیں۔

☆ اصلاحاتِ غالبؔ، صفحہ 57

☆☆ اعتقاد کی دو قسمیں ہیں : اعتقاد بالکسب اور اعتقاد بالحُب

شعرِ غالبؔ میں دونوں اقسام مراد ہیں۔ اسی لیے ''اعتقاد'' کا ایک پہلو اکتساب بھی ہے، شعوری ہو یا غیر شعوری۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ غالبؔ کے شعر میں ناسخؔ کے مصرع ''آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں'' میں ''معتقدِ میر'' کو ''مکتسبِ میرؔ'' سمجھنا روا ہے۔ لیکن خود ناسخؔ کے لیے اکتساب وفیض مراد لینا درست نہیں، کیوں کہ ناسخؔ اسلوبِ اظہار میں میرؔ سے فیضان اخذ کرتے ہیں نہ قدرتِ زبان میں میرؔ کے قریب پہنچتے ہیں بلکہ بقولِ ڈاکٹر سید عبداللہ ''ناسخؔ نے محض رسماً میر کی معتقدی جتائی ہے''۔ اگر ناسخؔ کے ہاں کچھ قابلِ تعریف ہے تو وہ ان کا تعجب انگیز اختراعی انداز ہے، جس کی خود غالبؔ نے بھی تعریف کی۔ طرزِ میرؔ اختیار کرنے کا مضمون رندؔ کے ہاں بھی ہے لیکن پر لطف بات یہ ہے کہ اُن کے ہاں نصف غزل بھی میرؔ کی طرح کی نہیں۔ جبکہ غالبؔ کے ہاں شعوری مماثلات کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ یہ سچ ہے کہ غالبؔ کی میرؔ سے جزوی مماثلت براہِ راست استفادے یا جذبِ اثر کے بغیر بھی ممکن ہے۔ لیکن ہم بالیقین کہتے ہیں کہ غالبؔ اور میرؔ کے مابین فکری مماثلتیں ان کی باہمی ذہنی اور نفسی ہم رنگی کی غماز ہیں۔ ان دونوں کے جذب وجبلت کے قماش کے بیشتر نقوش ایک وضع کے ہیں۔

2۔ایک وجہ شمس الرحمان فاروقی نے بھی لکھی ہے :

"غالبؔ کی نظر میں ظہوری کتنا ہی موقر رہا ہو، لیکن میرؔ کو ریختہ کا ظہوری کہنا کچھ مناسب نہیں، کہ ظہوری سے بھی بڑے شاعر فارسی میں موجود تھے۔ظہوری خیال بند شاعر تھا جبکہ میر کیفیت اور معنٰی کے شاعر تھے۔ لہٰذا غالبؔ نے مصرعِ اولیٰ کو بدل دیا"۔ [☆]

میرؔ کی بوطیقا سے یہاں بحث نہیں۔البتہ اُن وجوہات کا اجمالی تذکرہ عین بجا ہے جن کی بنا پر میرؔ کے پایۂ سخن پہ تمام جدید و قدیم شعرائے اردو ناصیہ فرسا ہیں، بالخصوص غالبؔ سا خالص تجریدی شاعر۔

زبانِ میرؔ: ریختہ گوئی میں میرؔ کی استادی مسلم ہے۔ان کی زبانِ سخن میں سلاست،بے تکلفی، بے ساختگی، عامیانہ پن۔(عامیانہ پَن سے مراد عوامی سطح کی نہیں بلکہ عوامی جذبات کی نمائندگی کرنے والی زبان مراد ہے) یہی وجہ ہے کہ ان کے سب اشعار خواص پسند ہیں۔انھوں نے زبان کے پورے امکانات کو روشن کر کے اس کی ظاہری و مخفی ساختوں کو شعری اظہار کی اعلیٰ ترین سطحوں پہ فائز کیا۔عبدالمغنی نے درست لکھا ہے کہ ان کی زبان اور اسلوبِ بیان میں کسی تصنع اور تکلف کی عمل داری نہیں۔جملوں کی ساخت، روانی، متن میں پوشیدہ تہذیبی علامتوں کا تعین، معنویت، آہنگ اور بحر وغیرہ میں وہ منفرد شان رکھتے ہیں۔(آہ سیتاپوری نے اس پہ مفصّل لکھا ہے) اسلوبِ میرؔ کا قوی عنصر زبانِ میرؔ ہی ہے۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں :

"میرؔ کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے پوری اردو کے ادبی حسن کو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ آشکار کیا۔ ٹھیٹھ بول چال کی زبان سے انھوں نے شاعری کی زبان وضع کی اور فارسی اثرات کی خوش آہنگ آمیزش سے ایکائی اظہار کی ایسی ایسی رفعتوں تک ایک نوزائیدہ زبان کو پہنچا دیا کہ باید و شاید۔میر کے یہاں حسن کاری اور تہ داری کی بنیادیں دراصل زبان کی جڑوں میں پیوست ہیں" [☆☆]

میرؔ کا اندازِ تشکیل : اسلوبِ میر میں انفرادی ندرت کی کارفرمائی بہت ہے۔ کیوں کہ ذاتی کشش Peraonal-Impressiveness اور ندرتِ احساس ان کے ہاں وضعیت کے لازمی اجزاء ہیں۔میرؔ کا اسلوب ان کے عہد کے مجموعی تشخص کا روشن اظہاریہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میر کا سمجھنا سہل نہیں۔ان کی بصیرت تہ در تہ ہے۔انھوں نے اپنی موجِ سخن کو بلاوجہ صدرنگ نہیں کہا تھا:

جلوہ ہے مجھی سے لبِ دریائے سخن پر — صدرنگ مری موج ہے میں طبعِ رواں ہوں

آفاقیت یعنی Universality: میرؔ کا مشاہدہ دُور بینی شان رکھتا ہے۔اُن کا کہا ہر عہد میں بامعنٰی ہی نہیں انبساط و مسرت بہم بھی پہنچاتا ہے۔ تفہیمِ کائنات میں ان کے موضوعہ اصول آج بھی اتنے کارآمد ہیں جتنے ان کے دور میں۔آفاقیت کی ضد قطعیت واختصاص Particularity ہے۔عجب ماجرا یہ ہے کہ میرؔ کے اسلوب

☆ غالبؔ پر چار تحریریں، صفحہ 96

☆☆ اسلوبیاتِ میر از ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، صفحہ 84

میں آفاقیت اور قطعیت دونوں اپنے اپنے زاویوں میں موجود رہتے ہوئے بھی متوازی سفر کرتے ہیں۔ اسی لیے فراقؔ نے کہا تھا: معلوم ہوتا ہے کہ میر نہیں بول رہے بلکہ ہماری انسانیت اور ہماری فطرت بول رہی ہے۔
میرؔ کا شخصی احساس: یعنی اقبالؔ کی خودی کا مظہر۔ میرؔ کی شخصیت کا یہ پہلو براہِ راست ان کے فن پر اثر انداز ہوا ہے اور ضمناً اُس کی شہادت تمام مستند شعراے اردو نے دی ہے۔

A Little Fable - By : Franz Kafka
Translated by Willa and Edwin Muir

"ALAS," said the mouse, "the world is growing smaller every day. At the beginning it was so big that I was afraid, I kept running and running, and I was glad when at last I saw walls far away to the right and left, but these long walls have narrowed so quickly that I am in the last chamber already, and there in the corner stands the trap that I must run into." "You only need to change your direction," said the cat, and ate it up.

(The Complete Stories, By FRANZ KAFKA, P# 370)

ایک چھوٹی سی کہانی- [اردو ترجمہ: دائمؔ]

”افسوس!“ چوہا بولا
”یہ دنیا روز بہ روز چھوٹی ہوتی جا رہی ہے۔ شروع دنوں میں تو یہ اتنی بڑی ہوتی تھی کہ مجھے ڈر لگتا تھا۔ میں بھاگتا ہی رہا ہوں، بھاگتا ہی رہا ہوں۔ اور جب آخرش دور کہیں دائیں بائیں دیواریں نظر آنے لگیں تو مجھے نہایت فرحت کا احساس ہوا۔ لیکن یہ طویل دیواریں اتنی عجلت میں تنگ ہوتی گئیں کہ کنارے ہٹتے ہٹتے اب میں آخری کوٹھڑی میں آ پہنچا ہوں۔ اور اس کوٹھری کے اس سرے پر چوہادان لگا ہوا ہے، جس میں مجھے کبھی داخل ہونا ہی ہے“۔
”تمھیں چاہیے کہ اپنا رُخ بدلو“۔ بلی نے کہا اور اسے کھا گئی۔

تتلیاں آواز دیتی ہیں (افسانچہ)

نصرت اعوان☆

شام دور کھڑی شرما رہی تھی۔ آسمان سورج کی آخری تمازت سے گلابی ہونے لگا تھا۔ پرندوں کے جھنڈ اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف محوِ پرواز تھے۔

ہر روز نمازِ عصر کے بعد یہ منظر چائے کا کپ ہاتھ میں لیے بالکنی سے دیکھنا میرا معمول تھا۔

میں کچھ دیر کے لیے ارد گرد کے ماحول سے کٹ کر قدرت کے اس راز میں گم ہو جاتی۔ تفکرات اور ذمہ داریوں سے کچھ وقت کے لئے آزاد ہو جاتی۔ نیچے بلڈنگ کے لان میں معصوم بچپن کھلکھلاتا ہوا بکھر جاتا۔

پھولوں کو پھولوں کے ساتھ کھیلتے دیکھ کر میں بھی بچپن میں چلی جاتی ہوں۔ میرا بچپن!

میں نے دیکھا۔

میرا گھر کتنا سادہ، کتنا زندگی سے بھرپور تھا۔ امی آنگن کے کونے میں بنے چھوٹے سے باورچی خانے میں کچھ بنانے میں مصروف ہیں۔ ایک لڑکی جس نے دو چوٹیاں کس کر بنائی ہوئی ہیں، شلوار کے پائنچے اونچے کیے ہوئے، ایک ہاتھ میں جھاڑو لیے دوسرے میں بالٹی، اور وہ مگ سے پانی نکال کر سرخ اینٹوں کا فرش رگڑ رگڑ کر دھو رہی ہے۔

اسکی دلچسپی کو دیکھ کر لگتا تھا کہ جیسے اسے دنیا میں کوئی اور کام نہیں کرنا، سوائے فرش دھونے کے۔

دروازہ کھلا اور ایک لڑکا گندے جوتوں سے اندر داخل ہوا۔

"اے آبی! وہیں رک! جوتے وہیں اتار! امی ی ی ی ی!" وہ چلائی

عابد چہرے پر شرارت لیے جوتوں سمیت فرش پر کیچڑ کے نشان چھاپتا برآمدے میں چلا آیا اور تخت پر بیٹھی دادی کی گود میں سر رکھ کر لیٹ جاتا ہے۔ دادی تو واری واری جانے لگتی "میرا بچہ، میرا شہزادہ!!" وہ غصے کے مارے آگ بگولا ہو گئی۔

تب میں اس لڑکی کے چہرے کو دیکھتی ہوں، بغور! کتنی شفافیت اور معصومیت تھی! کتنی ملاحت زمانے کی

☆ افسانہ نویس، مترجم، مائیکرو فکشنسٹ

گندگی اور آلودگی سے پاک چہرہ! مطمئن، پرسکون روح!

باباجانی کی آواز آتی ہے۔ باباجانی دروازے کے پاس ہی جوتے اتار دیتے ہیں اور وہ بھاگ کر انکے لیے چپل لے کر آتی ہے جوان کے قدموں میں رکھ کر ہاتھ سے تھیلا پکڑ لیتی جس میں روز سبزی اور پھل ہوتے۔ باباجانی کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹے۔ اس نے وہ تھیلا دادی کے پاس رکھ دیا اور عابد کو گھورتی ہوئی گھڑے میں سے پانی نکال کر باباجانی کو دینے آئی تو وہ مسکرا دئے۔ سر پر ہاتھ پھیرا۔

''میری شاہزادی، میرا بیٹا!''

یہ لفظ سنتے ہی اس کے وجود میں توانائی و محبت کا انوکھا احساس ہوتا تھا۔

یہ سب اب کہاں! آہ..!

میں سوچنے لگی، سب بچھڑ گئے۔ میں بھی تو خود سے بچھڑ گئی۔ میں کہاں کھو گئی؟ میرے سب رشتے، وہ بھائی، چھوٹی بہن، جن کے ملک سے باہر ہونے پر کبھی کبھی کی رسمی سی دعا سلام رہ گئی۔ راہیں تھک چکی تھیں اور احساس جامد ہو چکا تھا۔

کھوئے ہوئے بچپن کو ڈھونڈتی ڈھونڈتی بہت دور نکل آئی تھی۔

وہ گلی بھی تو تھی جہاں زندگی کی انوکھے انداز میں مجھ میں دھڑک رہی تھی۔ روز گزرتی تھی کالج کے لیے وہیں سے۔ وہ بند گھر کرائے پر اٹھایا جاتا تھا۔ سنا تھا اب کوئی فیملی نہیں آتی تھی۔ کوئی تنہا وجود تھا اس میں شاید کوئی لڑکا تھا جو اکثر ہاتھ میں فائل لیے ہوئے میرے نزدیک سے گزرا تھا۔ سر جھکائے ہوئے، کبھی سر اٹھا کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی یہی محتاط روش مجھے سوچنے پر مجبور کر گئی۔ اس سے پہلے کہ سوچوں کو پرواز ملتی، شادی کر کے پردیس دوسرے شہر کوچ کر گئی۔ سب ماضی کا حصہ بنتا گیا۔ اور پھر زندگی میں دو گلاب کھل گئے۔ انکو سینچتے سینچتے زندگی یوں گزری کہ اب سب خواب لگتا ہے۔۔م لیکن ہر شام بیٹھ کر اس خواب کو کچھ دیر آنکھیں بند کر کے دیکھتی ہوں۔ روز اپنے کھوئے ہوئے وجود کو ڈھونڈنے۔ جیسے آج بیٹھ کر دیکھ رہی ہوں، تب ہی اندر سے بیٹی زور سے چلائی: ''مما! سمجھائیں بھائی کو، ریموٹ نہیں دے رہا'' اندر سے بیٹے کی ہنسی سنائی دی۔

کہاں گم ہے میرا بچپن؟

یہی تو میرا عکس ہے۔ میری طرح میرے عابد کی طرح میری زندگی کی یہی تو اصل سچائی ہے۔ یہی تو وہ خوشیاں ہیں جو چھوٹ گئیں، لیکن کہاں؟ وہ تو ہمارے بچوں میں چھپی ہوئی ہیں۔

❁❁❁❁❁

''اقبال کی شاعری ملکوتی آوازوں کا کارخانہ ہے''۔ احمد جاوید

استقبالِ نور کیا رنگ برنگ سلیقوں سے
ہم نے برکھا دیوی کو دیکھا سات طریقوں سے

نم آنکھوں کا نیل گگن، پل بھر میں گھنگھور ہوا
اب پلو رسوا ہو گا، آنسوؤں پر تحقیقوں سے!

کھلیانوں کی پیلاہٹ جب چہروں تک پھیل گئی
ٹھنڈے دل بھی الجھ پڑے، شہد سمان رفیقوں سے

کاٹھ کی بستی میں ہر سُو ہرا ہرا تو دِکھتا تھا
کون کہاں تک تازہ ہوا، پوچھیں کن صدیقوں سے

پیرہنوں کی لالی سے لال کہاں لہرانا تھا
ہم نے ٹھنڈی آگ چکھی، حذَر کیا زِندیقوں سے!

جب جب جامنی ہونٹوں نے اِسموں کو الہام کیا
ہم نے کیسۂ بخت بھرا نئی نئی تخلیقوں سے

رُت کے شوخ پراندے سے جب دو رنگ اڑا بیٹھی
ہم نے برکھا دیوی کو دیکھا پانچ طریقوں سے

یاسر اقبال

شاعری میں نئے مضامین کیسے لائیں؟

شہزاد احمد شاذؔ☆

مضامین کی آمد کا انحصار آپ کے مطالعے، مشاہدے، ذاتی فہم و فراست اور عطائے ربّی پر ہے۔ان چیزوں میں سے کس پر کتنا انحصار ہے، اس میں ہر کسی کی اپنی رائے ہو سکتی ہے۔ کوئی مطالعے اور مشاہدے کو سرِ فہرست رکھتا ہے۔ کوئی زیادہ تر انحصار ذاتی فہم و فراست پر جانتا ہے۔اور کوئی عطائے ربّی کو اس عمل میں باقیوں سے زیادہ دخیل قرار دیتا ہے۔ بہر حال مطالعہ اور مشاہدہ بڑھایا جا سکتا ہے۔

فہم و فراست میں ترقی لانے کی سائنسی اور روحانی مشقیں موجود ہیں۔(ممکن ہے اس مضمون سے بھی آپ کوئی مشق اخذ کر سکیں)اور اسی طرح عطائے ربّی، اپنی طلب میں سر گردانوں پر مہربان ہو سکتی ہے۔

اگر پوچھا جائے کہ فہم و فراست کس وقت پوری طرح بیدار حالت میں ہوتی ہے؟ نیز مطالعہ اور مشاہدہ کس وقت زیادہ مفید ہو سکتا ہے؟

تو جواب ہو گا: اس وقت جب ہمیں دو جوہر میسر ہوں؛ اول جب دماغ تر و تازہ ہو، دوم اسے مکمل یکسوئی بھی حاصل ہو تو فہم و فراست کی بیداری کے سبب انسانی دماغ غور و فکر کے بہتر نتائج تک پہنچ پاتا ہے اور انہیں دو جواہر یعنی دماغی تر و تازگی اور یکسوئی کی بدولت ہی دماغ مطالعے اور مشاہدے سے زیادہ مقدار میں علوم کشید کرنے کی حالت میں ہوتا ہے۔ان دو جواہر کو ہر کوئی اپنے چوبیس گھنٹے کے معمولاتِ زندگی میں کسی جگہ تلاش کر سکتا ہے۔البتہ میں ایسا وقت تجویز کروں گا جہاں تیسری چیز یعنی عطائے ربّی کے حصول کا امکان بھی موجود ہے۔

میرا خیال ہے کہ عطائے ربّی اور الہامی مضامین (اگر کسی کا ایسے مضامین پر ایقان ہے تو) ان مضامین کے نزول کا بہترین وقت صبح صادق سے کچھ پہلے کا ہے۔ دینی اور دنیاوی معاملات میں جتنی بھی خیر اور بھلائی آسمانوں سے نازل ہوتی ہے یقیناً اس کا بہترین وقت یہی ہو سکتا ہے۔ گویا اسے نئے مضامین کے نزول کا بہترین وقت بھی گردانا جا سکتا ہے۔ یعنی فجر کی اذان سے تقریباً ایک گھنٹہ پہلے بیدار ہوا جائے تو عطائے ربّی سے حصہ پانے کی امید کی جا سکتی ہے اور یہی وہ وقت ہے جب سو کر اٹھنے کی وجہ سے آپ کا دماغ گزشتہ دن کی فکر اور تھکاوٹ سے آزاد ہو

☆ ماہرِ عروض

کر پوری طرح تروتازہ ہوتا ہے اور آپ کے ارد گرد کے ماحول پر سکوت طاری ہونے کی وجہ سے یکسوئی اپنے عروج پر ہوتی ہے۔ گویا یہ دو جوہر بھی بدرجہ اتم موجود ہوتے ہیں۔

آپ تہجد کے وقت جاگ گئے اب کیا کرنا ہے ؟اگر طبیعت مائل ہو تو وضو کر کے کچھ تلاوت یا نوافل ادا کر لیں۔ (یقینا یہ عمل عطائے ربی سے حصہ پانے میں مددگار ہوگا) اس کے بعد گھر سے باہر کھلی فضا میں نکلنا خطرناک نہ ہو تو فبہا، ورنہ صحن میں یا چھت پر جا کر تازہ ہوا اپنے اندر جذب کریں۔ اس کے بعد آپ اپنی فہم وفراست کو پوری طرح بیدار کر کے کائنات کے مطالعے اور مشاہدے پر لگا دیں۔

اپنے ارد گرد نظر گھمائیں، کائنات کی ہر چیز ہاتھ باندھے، سر جھکائے، بالکل خاموش آپ کے سامنے کھڑی ہے۔ آپ جس زاویہ سے چاہیں اس کا مشاہدہ کریں۔ آسمان ہو، آسمان پہ سفر کرتے بادل ہوں، جھلملاتے چاند ستارے ہوں، زمین ہو، زمین کی چھاتی میں پیوست درخت ہوں، مرکزی دروازے کے ساتھ لگی امر بیل ہو یا صحن میں پڑے گملوں میں پروان چڑھتے گلاب اور موتیے کے پھول ہوں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا ہو یا ہوا کے دوش پر سفر کرتی شبنم کی ننھی بوندیں یا پھر کہیں پڑوس سے آنے والی رات کی رانی کی خوش کن مہک؛ کوئی بھی چیز ہو، ہر ایک کے پاس سینکڑوں کہانیاں ہیں حتیٰ کہ آپ کے کمرے میں پڑے میز، کرسیاں اور دیواروں میں نصب دروازے، کھڑکیاں اور ان کے سامنے لٹکتے پردے ہر کسی کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے۔

بے زبانوں سے گفتگو:-

کائنات کا ذرہ ذرہ اپنے خالق کی ثناخوانی میں مشغول ہے۔ سو ان کے لیے قوتِ گویائی تو ثابت ہے۔ ہمیں اپنی قوتِ سماعت کے بہتر کرنے کی ضرورت ہے۔ جب کائنات کی ہر بولنے والی چیز خاموش ہوتی ہے تو کائنات کی ہر ایسی چیز کو سنا جا سکتا ہے جو نہیں بول سکتی اور اس کو آپ کانوں سے بھی سن سکتے ہیں اور آنکھوں سے بھی۔ بس ان چیزوں سے بات کرنے کے لیے ان کا اعتماد جیتنا پڑتا ہے۔ انہیں یقین دلانا پڑتا ہے کہ آپ ان کے بولنے کی صلاحیت پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ کسی ایسے شخص کے ساتھ گفتگو نہیں کرتے جس کا ان کے بولنے پر یقین نہ ہو۔ کیوں کہ ایسا شخص انہیں بولتا دیکھ لے تو کسی بھوت پریت کا سایہ سمجھ کر پاگلوں کی طرح شور مچاتا بھاگ کھڑا ہو۔ لیکن یقین جانیں اگر آپ ان سے بات کرنے کا معمول بنا لیں تو آہستہ آہستہ یہ آپ سے مانوس ہو جائیں گے اور آپ سے بات کرنے لگیں گے۔ بلکہ اتنا بولیں گے کہ چپ ہونے کا نام نہیں لیں گے۔ ممکن ہے، آپ کو ایک کی بات سننے کے لیے باقیوں کو ڈانٹ کر چپ کروانا پڑے۔ جیسے آپ صبح سویرے اٹھے، ہاتھ منہ دھویا، صحن میں نکلے، صحن میں موجود ہر چیز کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں اور ہر کوئی آپ کو متوجہ کرنے کے لیے کہانی سوچنے لگا۔ آپ کی نظر زمین پر پڑے ہوا کے ہلکے تھپیڑوں سے سرکتے پتے پر پڑے۔

پوچھا: بھائی! کیا بنی شاخ سے تمہارا بڑا تعلق تھا وہ رشتہ کیا ہوا؟ بے چارہ پتہ اپنی کہانی شروع کرنے ہی والا تھا کہ اس کے ساتھ اٹھکیلیاں کرتی ہوا بول پڑی:

جناب! اس سے کیا پوچھتے ہو؟ مجھ سے پوچھو! ان کے تعلق میں دراڑ کیونکر آئی؟ میں ایسے ہزاروں پتوں کی کہانیاں جانتی ہوں۔

ابھی آپ ہوا کی طرف متوجہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ صحن میں لہلہاتی گلاب کی ادھ کھلی کلی نے آپ کو آواز دے دی: ارے! چھوڑیے کن بیکار کی باتوں میں لگے ہیں۔ آیئے! میری تازگی اور نازکی دیکھیے اور پھر کچھ اپنے محبوب کے لب ورخسار کی کہیے! ہوا آپ کے دامن سے الجھتی رہ گئی اور آپ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کلی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ لیکن کلی کے دوبارہ لب کھولنے سے پہلے اس پر پڑا شبنم کا قطرہ بول پڑا: سبحان اللہ! یہ شگفتگی اور تازگی کس کی بدولت ہے بھلا؟ شاعر میاں! ہم نے اپنا آپ ان پر نچھاور کر دیا اور یہ ہیں کہ ہمارا کہیں ذکر ہی نہیں۔ کلی غصے سے لال پیلی ہوتے ہوئے: چپ رے! ایک تو میں نے تجھے رات گزارنے کی اجازت دی الٹا تو مجھ پر احسان جتا رہا ہے.... احسان فراموش! شبنم کا قطرہ جھینپ جاتا ہے؛ نہ جی نہ! احسان جتانے کا حق تو صرف آپ جیسے نازک لوگوں کو ہے۔ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ اگر آپ نے مجھے ٹھہرنے کی اجازت دی ہے تو میں بھی آپ کی شگفتگی کا سبب بنا ہوں۔

کلی غصے سے کانپنے لگتی ہے اور ہوا کے ہلکے جھونکے کے ساتھ جھول کر قطرے کو گرانا چاہتی ہے۔ ”تو پھر جا! کسی اور کو شگفتگی بخش!“

شبنم کا قطرہ گرتے گرتے سنبھلتا ہے اور الامان الامان پکار اٹھتا ہے: ”محترمہ دو گھڑی کے مہمان سے کاہے کو الجھتی ہیں؟ آج مجھ پردیسی کو کہہ لینے دیں تھوڑی دیر کی مہلت ہے خورشید کی کرنیں مجھے پھر سے ہوا میں تحلیل کر دیں گی اگلا پڑاؤ جانے کہاں ہو؟ میں کہاں کہاں سے گزر کر آیا، کل کہاں بسر کی اور پرسوں کہاں؟ میں تو یہ باتیں اور کہانیاں........

کلی پھٹ پڑتی ہے: پھر چپڑ چپڑ چپڑ چپڑ! تو چپ کرتا ہے یا نہیں؟۔ قطرہ: نہیں کرتا

کلی: تیری تو........ تکرار بڑھ جاتی ہے۔ اردگرد کا ماحول ان کی جملے بازی اور آپ کی حالت زار پر قہقہوں سے گونج رہا ہے اور آپ کانوں پر ہاتھ رکھ کر چلاتے ہیں خامووش!........

اب کوئی نہیں بولے گا جسے اجازت دوں صرف وہ بولے۔

آپ کسی پرفضا مقام پر جاتے ہیں وہاں فلک بوس پہاڑ، عمر رسیدہ درخت اور بل کھاتے کچے پکے راستے آپ کے لئے بہت سی کہانیاں اپنے سینے میں دبائے بیٹھے ہیں۔ ان راستوں سے جنگجوؤں کے لشکر گزرے ان راستوں نے ان سپاہیوں کے جذبات پڑھے کوئی جوانی کے جوش میں رزمیہ اشعار پڑھتا ہوا جھومتا گاتا جا رہا تھا۔ اسے اپنی بہادری پر بڑے انعام کی جستجو تھی اور کوئی سر جھکائے افسردہ دل اور بوجھل قدموں کے ساتھ روانہ تھا کہ اپنی بوڑھی ماں کو بے سہارا چھوڑ آیا تھا یا کوئی بادشاہ کا حکم پا کر اپنی نئی نویلی دلہن کی آنکھوں میں ڈھیر سارے سوال چھوڑ آیا تھا۔ ممکن ہے وہیں کہیں پہاڑوں کے دامن میں اجڑتی برباد ہوتی بستیوں کے لٹے پٹے قافلوں نے کچھ دیر کے لیے پڑاؤ ڈالا ہو یا ان پہاڑوں کی چوٹیوں پر پریمیوں نے محبت کے گیت گائے ہوں اور ساتھ جینے

مرنے کی قسمیں کھائی ہوں۔ یہ قصے یہ کہانیاں یہ گیت یہ قسمیں اور وعدے ان درختوں، پہاڑوں اور راستوں نے حساس اور لطیف سماعتوں کے لیے محفوظ کر رکھے ہیں۔ کوئی سننے والا ہو تو انہیں سنے اور کوئی دیکھنے والا ہو تو وقت کی سوئی کو الٹا گھما کر ان مناظر کا نظارہ کرے۔

حساسیت :-

لیکن ان مدفون صداؤں کو سن پانے والی خاص سماعتیں اور پردے سے اتر جانے والے مناظر کا نظارہ کر پانے والی بصارتیں، ہر کسی کو عطا نہیں ہوتیں۔ یہ معاشرے کے حساس لوگوں کے حصے آتی ہیں۔ جنہیں شاعر یا ادیب کہا جاتا ہے۔ سچا شاعر وہی ہے جو ان آوازوں کو سن سکے جنہیں عوام نہیں سن سکتے ان چیزوں کو دیکھ سکے جنہیں دیکھنے کے لیے محض ظاہری بصارت کافی نہیں۔ اور اسی بنیاد پر وہ کچھ نیا اور منفرد، سوچنے اور کہنے کے قابل ہوتا ہے۔

اگر آپ اس صف میں شامل ہونا چاہتے ہیں تو اپنے حواس پر جمی ظاہر کی دھول جھاڑنی پڑے گی۔ لیکن ٹھہریے! یہ آگہی اور حساسیت کا راستہ ہے۔ یہ سرخ لکیر ہے جسے آپ عبور کرنے جا رہے ہیں۔ اس سرخ لکیر کے اِس طرف جہالت اور بے حسی ہے لیکن سکون ہے، خوشیاں ہیں، بے فکری ہے۔ اور اُس پار آگہی، احساس اور ان کے پیچھے درد، اذیت، آنسو، آہیں..........

اس سرحد کو عبور کرنے کا فیصلہ سوچ سمجھ کر کریں کیونکہ اس مشق کے بعد ممکن ہے آپ اپنے ظاہری حواس پر اعتماد کرنا چھوڑ بیٹھیں۔ ممکن ہے آپ کو بولنے والی چیزوں سے زیادہ، نہ بولنے والی چیزوں پر اعتماد ہونے لگے۔ آپ نظر آنے والی چیز کو جھٹلا کر نہ نظر آنے والی چیز کا یقین کرنے لگیں۔

ممکن ہے آپ کسی مسکراتے چہرے کے پیچھے چھپا کرب دیکھ کر اپنی آنکھوں سے جھگڑا کرنے لگیں کہ تم جھوٹ بولتی ہو، یہ شخص مسکرا نہیں رہا یہ تو رو رہا ہے۔

ممکن ہے کوئی بوڑھا شخص کپکپاتی آواز میں کہہ رہا ہو "نہیں نہیں! میرے بچے تو میرا بہت خیال رکھتے ہیں" اور آپ اپنے کانوں کے کان کھینچ رہے ہوں کہ بوڑھا وہ بات تو نہیں کہہ رہا جو تم مجھے سنوا رہے ہو یہ تو بول رہا ہے کہ "میں اپنے بچوں کا گلہ بھی تو نہیں کر سکتا"۔

آپ کی حساس ناک عطر کی خوش گوار مہک میں رچی بداخلاقی اور کم ظرفی کی بدبو سونگھنے لگے گی اور کسی کے پسینے کی بدبو میں بسی، محنت لگن اور جذبے کی خوشبو محسوس کرنے لگے گی۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ آپ باطنی حواس کو جگا کر ظاہری حواس کو جھٹلانے لگیں گے بلکہ یہ آگہی اور حساسیت اور بھی بہت سے وبال لے کر آئے گی۔

جب آپ مسکراتی آنکھوں کے پیچھے چھپے آنسوؤں کے ابلتے سمندر میں جھانکنے کی کوشش کریں گے تو آپ کی نظر واپسی پر آنسوؤں کی ایک لہر آپ کی آنکھوں کے لئے بھی اٹھا لائے گی۔

جب کبھی انتہائی سنجیدگی سے اپنے کام میں مگن کسی شخص کے دل کو ٹٹولنے کی کوشش کریں گے تو آپ کے ہاتھ اس دل میں اٹھنے والی درد کی ٹیسوں سے لتھڑے واپس آئیں گے اور یہ درد آپ کو اپنے دل پر سہنا ہوگا۔
آپ یتیم بچے کے سامنے اپنے بچے کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کانپ اٹھیں گے اور پھر اپنے بچے کی آنکھوں میں ابھرتے سوالوں کو نظر انداز کرنے کی کوشش میں آپ کی آنکھیں ڈبڈبا جائیں گی۔ جن گلیوں سے کبھی آپ ہنستے کھیلتے اٹکھیلیاں کرتے گزر جایا کرتے تھے انہی گلیوں کے مکانوں کے در و دیوار اپنے مکینوں کے دکھ درد آہیں اور سسکیاں سنا سنا کر آپ کا راستہ کاٹیں گے۔ کل تک جسے آپ کسی افسردہ تحریر پر گر کر سوکھ جانے والا پانی کا قطرہ تصور کر رہے تھے اگر آج آپ اس میں سے کسی کی آنکھ کا نمک کشید کر رہے ہیں تو یہ نمک یقیناً آپ کے زخم کے کام آئے گا۔ گویا کہ آپ درد کے گاہک بن جائیں گے درد اور غم کے بدلے راحت اور خوشی بیچنے والے سوداگر، یہ کاروبار گھاٹے کا ہے یا فائدے کا، اس کا فیصلہ آپ کریں۔
بہر حال اس سرخ لکیر کو اپنی ذمہ داری پر عبور کریں۔ اگر مجھ سے پوچھیں تو یہی کہوں گا کہ زندہ تو وہی ہے جس کا احساس زندہ ہے۔ البتہ بے حس معاشرے میں حساس شخص کو روز مرنا پڑتا ہے اس لیے اسے آدھا زندہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔

شکستِ ناروا

شکستِ ناروا کے عیب ہونے کے بارے میں شک اس لیے ہو سکتا ہے کہ ایرانی عروضیوں نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ وجہ یہ ہے کہ ہمارے عروض میں (یعنی عربی، فارسی اور اردو عروض میں) ''وقفے'' کا تصور ہی نہیں ہے۔
قاضی عبدالودود نے صراحت کہا ہے کہ ''شکستِ ناروا'' نام کا عیب کسی پرانی فارسی کتاب میں مذکور نہیں۔ شکستِ ناروا کی بہت سی مثالیں مؤمن جیسے شخص کے یہاں بھی بہت ملتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم مؤمن کے زمانے تک اسے عیب نہیں تصور کرتے تھے۔ مؤمن کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں:

اے گرم نالہ ہائے آتش فگن گئے ہو　جاؤ تو جاؤ سوئے دشمن سوئے فلک کیوں

دونوں مصرعوں میں وقفہ اس طرح پڑا ہے کہ اضافت (جو واحد اکائی کا حکم رکھتی ہے) دو ٹکڑے ہو گئی ہے۔

بحوالۂ شعرِ شور انگیز۔ شمس الرحمن فاروقی، 1/484

غزل

(وَیش کی آنکھ)

بھول بھٹک میں کھوج لگاوے یعنی اُس غم کیش کی آنکھ
اَنت ابھوگی آنکھ نریش کی شاید ہو بےخویش کی آنکھ

اک برجوگ ہنیرا جھاٹا گانٹھ کے پاوَک پھنکارے
مور کے پنکھ میں پدماسَن کی جھلمل کرتی ویش کی آنکھ

گپت معمّا، بھید کی چشمک اَنت اجاگر ہو جاوے
دید کرے مافوق الفطرت کی ہے اک درویش کی آنکھ

کروٹ کروٹ رتیا جاگوں، پھر بھی گربھ بچھور جنے
ساحل باندھ کے نندیا آگے بیٹھ چکی اندیش کی آنکھ

لام لہو کا ہتھیارا، یہ رمز بجھائی جاوے یوں
بُلبُل کے کاندھے پہ اشارت دھرتی ہر ہر پیش کی آنکھ

لوہو اگلتی گھاتِک کی مورت کے سبھاؤ چُنتی ہوئی
سخت نراشا، کیا ڈھونڈے گی بادامی دل رَیش کی آنکھ

ہونٹ کی تختی شَبد سجائے پریم کے، گہری لنکا جُوں
یکسر ہر جنگاہ لنڈھائے دائمؔ دھرم اُپدیش کی آنکھ

غلام مصطفیٰ دائم اعوان

He Wishes For Clothes of Heaven

Had I the heavens' embroidered cloths,
Enwrought with golden and silver light,
The blue and the dim and the dark cloths
Of night and light and the half-light,
I would spread the cloths under your feet:
But I, being poor, have only my dreams;
I have spread my dreams under your feet;
Tread softly because you tread on my dreams.

William Butler Yeats

مرے پاس جو ہوتے آسمان کے کاڑھے ہوئے
رُوپہلی سنہری روشنیوں سے بنوائے
راتوں کے، روشنیوں کے اور دھندلکوں کے
کیا کالے، کیا نیلے، اور کیا مدھم کپڑے
ترے پیروں تلے میں سارے کے سارے بچھا دیتا
میں مفلس ہوں، مرے پاس ہے کیا خوابوں کے سوا
ترے پیروں تلے میں نے خوابوں کو بچھایا ہے
مرے خوابوں پر تُو چلتی ہے، ذرا ہولے چل!

ترجمہ : یاسر اقبال

ادلا بدلی (افسانہ)

افسانہ نویس : حیا غزل

شہر کی مصروف ترین شاہراؤں پر دوڑتی بھاگتی، ہارن بجاتی، چیختی چنگھاڑتی، اکثر و بیشتر بنا سائنسلر کی دھواں چھوڑتی گاڑیوں اور ٹریفک جام میں پھنسے بے بس لوگوں کے بگڑتے مغلظات بکتے چہروں کے بیچ بار بار کلائی کی گھڑی کو بے چینی سے تکتے، اپنے لیے راستہ بناتے ہوئے، فٹ پاتھ پہ بنے نائن زیرو کے سائن تک پہنچنا آسان نہیں، پھر آفس کی باہر سے ہڑپہ یا موہنجو دوڑو کے زمانے کی آثار قدیمہ کی نئی دریافت شدہ دکھنے والی عمارت جو اندر جانے پر کھل جا سم سم کے اندرونی غار کا نقشہ پیش کرتی۔ ایک لال بھبھوکا منہ لیے کھڑوس باس کے ساتھ جسے آفس کے عملے کے ہر آدمی کو چوکیدار کے بعد اپنے ہاتھ پہ سجی قیمتی رسٹ واچ کو دیکھتے ہوئے خوش آمدید کہنے کا خبط تھا۔ یہ تو تھا میرا آفس اور اب میں آپ کو اپنے گھر لیے چلتا ہوں۔

میرا گھر جہاں سب ایک دوسرے سے منہ پھیر کر اور ایک دوسرے کا جی جلا کے زندگی گزار رہے تھے۔ جب کسی کے چہرے پہ پریشانی یا تکلیف کے آثار ابھرتے تو یہ بنا کسی سیاست دان کے دیئے لولی پوپ وعدوں کے نہال ہو جاتے۔ جیسے باہر ہونے والی ساری ناانصافیوں اور ناکامیوں کا ایک دوسرے سے انتقام لے رہے ہوں۔

دونوں جگہ جیسے دو مختلف محاذ کھلے تھے۔ صبح آفس میں اپنی ذمہ داریاں نبھاؤ اور شام سے صبح تک گھر میں، جہاں میں اکثر رات کو بستر پہ آنکھیں موندے راتوں رات لکھ پتی ہونے کے خواب دیکھتا شاید یہی چند میری مصروف ترین زندگی کے طمانیت بھرے لمحے تھے۔ میری بیوی سیما جو شادی کے وقت مجھے دنیا کی خوبصورت ترین عورتوں میں سے ایک لگتی تھی۔ اب کافی بدل گئی تھی یا میری ہی آنکھوں پہ لگے چشمے کے عدسے کا نمبر بدل گیا تھا دنیا کی ہر بیش قیمت چیز سے کہیں زیادہ قیمتی اور خوبصورت دکھنے والی اس کی مسکراہٹ اب مہینے کی پہلی تاریخوں میں تنخواہ کا پھولا ہوا لفافہ وصول کرتے ہی مختصر سے لمحے کے لیے نظر آتی پھر معدوم ہو جاتی اور اس کی مخروطی انگلیاں بنا ٹائپ رائٹر کے

ہواؤں میں مہینے بھر کے راشن، بجلی گیس کے بل، بچوں کے اسکول ٹیوشن کی فیس اور اماں ابا کی دواؤں کا حساب جوڑنے میں مصروف ہو جاتیں۔ اس بیچ میں صرف اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات اور آخر میں اترتی مایوسی کا بغور مشاہدہ کرتا۔ مجھے احساس تھا میرے ساتھ جڑتے ہوئے ہر نو بیاہتا لڑکی کی طرح اس نے بھی آئندہ زندگی کے لیے کچھ سپنے سنجوئے ہوں گے جو مجھ جیسا ناکام انسان پتہ نہیں کبھی پورا کر بھی پائے گا یا نہیں۔ میرے پاس تو اپنے بوڑھے باپ کی بڑھتی ہوئی دل کی بیماری کا علاج تھا نہ ماں کی آنکھ میں اترتے موتیے کا، بس زندگی پَر لگا کر اڑ رہی تھی یا ہم زندگی کو پر لگا کر اڑانے کی تیاری میں تھے۔

مجھ سے زیادہ سب کو پہلی تاریخ کو آنے والے مہمان کا انتظار رہتا گویا میری ضرورت بس اسی حد تک رہ گئی تھی۔ گھر سے باہر جاتے وقت گھر کا ہر فرد بڑی دیر تک آئینے کے سامنے کھڑا رہتا اور سب کے ساتھ ساتھ میں بھی اپنا آپ کھو جتا، ہم سب ہی اپنے چہروں پر دوسرا اچھا سا آرٹیفیشل ماسک چڑھاتے ہیں۔ ہنستے مسکراتے جھوٹے پن سے دنیا کو اپنانے اور اپنی چالاکی کو کیش کرانے کے لیے اچھا میک اپ اور اچھی ایکٹنگ شاید بہت ضروری ہو گئی ہے۔

بچوں کی نت نئے بدلتی دلچسپیوں میں ایک نیا اضافہ ہو گیا تھا۔ نہ جانے کہاں سے ایک نیا شوق پال لیا جس نے گھر میں آتے ہی سب کی زندگی یکسر بدل کر رکھ دی تھی۔ جس کا صرف نام ہی ہیپی نہیں تھا، خوشی ہر کسی کی میراث ہوتی بھی نہیں ہے اور ہر کسی کی خواہش پہ ملتی بھی نہیں ہے۔ اپنے بچوں کے پریشان کرتے سوالوں پہ اکثر گھبرا کر بغلیں جھانکنے لگتا تو سیما ٹھنڈی سانس بھر کے اپنا سر پیٹ لیتی اور مجھے چاروں طرف دھواں ہی دھواں نظر آنے لگتا اور دھواں کے بیچ ڈگڈگی کی وہ ڈور جس کا ایک سرا میں نے اپنے گلے میں باندھ کے دوسرا اس کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ میں باریک تار پر دونوں ہاتھ پھیلائے کرتب دکھاتا چلتا اور سب زور زور سے تالیاں پیٹتے.... لیکن ہیپی کے آنے کے بعد میرے حصے کی آدھی ذمے داری اس نے سنبھال لی اور شاید آدھی تالیاں بھی.... گھر کے اندر ہر آتے جاتے پہ اس کی نگاہ رہتی.... بنا اجازت اندر گھس آنے والی بلیوں اور دیوار پہ بیٹھنے والے کوؤں اور ڈور بیل بجا کے بھاگنے والے بچوں سے نمٹنا اب اس کی ذمے داری تھی جو اسے کافی تھکا دیتی۔

کسی کو پیار آتا تو اس پہ، ہنسی آتی تو اس کی حرکتوں پہ، اس کی پسند ناپسند کا خیال رکھا جاتا، محبت جتائی جاتی تو اس سے، کبھی کبھی مجھے لگتا جیسے خاندان کے سربراہ کی کرسی بھی اس نے مجھ سے چھین لی ہو۔ کبھی کبھی جب وہ میرے بستر پہ چڑھ کے میرے گلے میں اپنی بانہوں کا ہار ڈال کر میرا گال چوم لیتا تو میں بے دلی سے اپنے گال پہ آئی محبت کی وہ نمی پونچھ دیتا اور آہستگی سے اسے سیما کی طرف دھکیل دیتا جس کا

وہ خوشدلی سے خیر مقدم کرتی۔ ان دونوں کا پیار دیکھ کر میرا دل اندر سے، ہیپی کی جگہ لینے کی ضد کرنے لگتا۔ اسے روز صبح باہر گھمانے کی ذمے داری بھی میری ہی تھی۔ صبح کا اجالا جو ہمیشہ ڈھیروں امیدیں لے کر آتا ہے.... ہونے سے پہلے ہی وہ میرے بستر میں گھس آتا جیسے کہہ رہا ہو رات بھر خواب دیکھتے تھکے نہیں.... وہ سب دیکھنے کا فائدہ جو تمہاری قسمت میں ہی نہیں چلو آؤ باہر چلیں سورج کی روپہلی کرنوں میں کچھ نیا کھوجیں.... مسرت کی رنگ برنگی شوخ تتلیاں پکڑیں.... کوئی انوکھا خیال ڈھونڈیں یا کوئی دلچسپ حادثہ جو زندگی یک دم بدل کے رکھ دے۔

آفس کے لیے نکلنے سے پہلے اگر میں تھوڑی دیر اسے سڑک پہ نہ ٹہلاتا تو وہ کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے بھوں بھوں کر کے پورا گھر سر پہ اٹھا لیتا اسے بھی کسی آرٹسٹ کی طرح باہر کی دنیا اور نظاروں کا شوق تھا۔ میری رسی اب سیما سے، ہیپی کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ وہ آگے آگے بھاگتا اور میں اس کے پیچھے گھسٹتا چلا جاتا۔ انسانوں کی دل پھینک بیماری کا کچھ فیصدی حصہ اس میں بھی بدرجہ اتم موجود تھا جبھی تو پارک میں ٹہلتے وقت میری اور اس کی نظریں ایک ساتھ ایک ہی سمت حرکت کرتیں۔ وہ نتھنے چوڑے کر کے آنے والی کی خوشبو سونگھتا میں چین والی کو دیکھ کے.... اپنی آنکھیں تاپتا، ایک انجانے قرب کی مہک، دھیمی سی مسکراہٹ کی ٹھنڈک میرے اندر کی تھکن کسی حد تک اتار دیتی.... نہ جانے وہ باہر کیا کھوجتا تھا۔ کبھی اپنے پنجوں سے زمین کریدنے لگتا تو کبھی اپنی کوئی خواہش اسے چھلانگ لگانے پر بے تاب کر دیتی۔ آتے جاتے لوگ اسے دیکھ کر مسکراہٹ کا تبادلہ کرتے یا میرے اوپر ہنستے۔ وہ کتنا خوش قسمت تھا جو چاہے جہاں چاہے کھا لے یا سو لے۔ کبھی کبھی میرا من بھی اس کی طرح سب کو اندر سے کریدنے کا کرنے لگتا.... اس کے لیے ہر موسم دلکش تھا اور میرے لیے صرف تپتی دھوپ.... اس کے لیے ٹھنڈی ہوائیں، مزیدار خوشبوئیں، انوکھے منظر، دلچسپ کھلونے اور میرے لیے حسرتیں..!!

آج پھر آفس پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ میرے کھڑوس باس نے مجھے ٹھیک اسی جگہ ریسیو کیا جہاں اسے ہونا چاہیے تھا۔ اس کے خیال میں میرا وجود بھی ڈسٹ بن میں پڑے خالی کاغذ کے پرزوں کی طرح بے کار ہو گیا تھا جسے کافی استعمال کیا جا چکا تھا۔ یہ صورت حال میرے لیے کافی پریشان کن بلکہ خوفناک تھی۔ مجھے اپنی سیٹ پہ للچاتی نظروں کا بھی اندازہ تھا اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ آئندہ ایسا موقع کسی کو نہیں دوں گا۔ گھر آتے ہی میں نے پہلی دفعہ بغاوت کی اور ہیپی کو باہر لے جانے کی ذمے داری سیما پر ڈال دی.... سب، ہیپی کے لیے بات کرنے کا بہانہ ڈھونڈتے میں چپ چاپ سر ہلا کے ٹال دیتا.... بہت بزدل تھا۔ شاید مجھ میں کسی کو جواب دینے کی سکت تھی نہ کسی پہ کوئی رعب جھاڑنے کی.... میری بے

رخی،ہیپی نے بھی محسوس کرلی تھی۔ بھوں بھوں کرتے میری ٹانگوں سے لپٹ جاتااور حسرت و یاس سے مجھے تکتا۔ شاید اسے بھی چین والی کی یاد ستارہی تھی۔ اب مجھے بھی باہر کوئی نظر بھر کے نہیں دیکھتا یا شاید محض ایک آدمی سمجھ کے نظرانداز کردیتے۔ مجھے اکتاہٹ ہونے لگی شاید ہیپی کے پیچھے بھاگتے بھاگتے ہانپنااس سے کہیں بہتر تھا کہ میں کھلی ہوامیں اداس بیٹھ کر کوئی خیال پکڑتااوراس پر کچھ لکھتا.... بالآخر اسے بھی تو ڈسٹ بن میں ہی جاناتھا۔ یونہی خیالوں میں کھویاہوا گہری خاموشی کے ساتھ روز کی طرح میں اندر سے اپنا آپ ٹٹول رہاتھا کہ میری میز پہ رکھاانٹر کام بجنے لگااور مجھے واپس زور سے اس ٹیبل پر لا پٹخا جس پر میں کسی ہائی ریاست کے سلطان کی طرح ٹانگ پر ٹانگ جمائے بیٹھاتھا۔ دفتر میں اکثر لوگ میرے اس انداز سے خائف رہتے۔ خیر! ریسیور اٹھایاتو دوسری طرف میرا باس تھا۔ اس نے مجھے فوراً اپنے کمرے میں طلب کیاتھا۔ اندر جو ہوا وہ میری پہلے سے کی گئی توقع کے عین مطابق تھا۔

عاصم! لگتاہے تم کافی تھک گئے ہواور اپنی ذمے داری بھی ٹھیک طرح نہیں نبھا پارہے ہو، شاید تمھیں آرام کی ضرورت ہے۔

نن.... نہیں نہیں! سر میں بالکل فٹ ہوں۔ میں نے اپنے ماتھے پہ ان دیکھا پسینہ صاف کیا۔

شاید آپ سمجھے نہیں یا میری باتیں آپ کو مذاق لگ رہی ہیں۔ مسٹر عاصم! مجھے کام چاہیے جو آپ مجھے نہیں دے پارہے۔ اس لیے میں نے اس سیٹ کے ایک نیا بندہ رکھنے کا فیصلہ کرلیاہے....

Now-leave-me

میری کنپٹی چٹخنے لگی۔ جاب ختم تو سب ختم.... گذرے روز و شب آنے والے دنوں کی ہول ناکیوں سمیت جیسے دماغ کی پردۂ اسکرین پر نمودار ہوگئے۔ میں نے اضطراری کیفیت میں اپنے ماتھے پہ آیاان دیکھا پسینہ رومال سے صاف کیا۔

سوری سر! آئندہ آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔ میں سارا کام وقت پہ کروں گا۔ پلیز! سر آخری موقع دے دیں۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی باس کی خوشامد پر اتر آیاتھا۔ میری آنکھوں کے سامنے گھر سے وابستہ ادھورے سپنے اور سب کے افسردہ چہرے ناچنے لگے۔ مجھے گھسے پٹے رویوں کی عادت ہو گئی تھی لیکن وہ جارحانہ بھی ہوسکتے تھے۔ ایک ناکام بے کار انسان جس کی ضرورت ختم ہوجائے۔ مجھے ہیپی کو اپنی جگہ لیتے دیکھ کر ہمیشہ دکھ ہوتاتھااور اب میں ہاتھ اور گھٹنے زمین پہ ٹیک کے زبان باہر نکال کر ہانپ رہاتھااور میری پھٹی پھٹی آنکھیں کرسی پہ ایستادہ شخص پہ مرکوز تھیں۔ نہ جانے کب اور کیسے میں نے ہیپی کی جگہ چھین لی تھی۔

◊◊◊◊◊

(خاکہ) غالبِ ثانی

صاعقہ علی نوری☆

کچھ لوگ اپنی ذات میں کائنات ہوتے ہیں۔ بہت انمول، بے مثال۔ وہ جن کی زندگی دوسروں کے لیے مشعلِ راہ ہوتی ہے۔ جن کے لفظ لفظ سے حقیقت کے رنگ اور حرف حرف سے پھوٹتی روشنی طالبانِ علم وہنر اپنی استطاعت کے مطابق سمیٹتے رہتے ہیں مگر دینے والے کی چمک ماند نہیں پڑتی۔ وہ جو توقیر کا حوالہ، تنویر کا وسیلہ اور تعمیر کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ وہ جن کے عرفان سے پھوٹتے اجالے شبِ گیتی کی میلی فضا کو کافور کر دیا کرتے تھے۔ ایسی ہی روشنیوں سے بھری، خوشبوؤں سے مزین، ہر سو آگہی کی گوہر افشانی کرتی، شاندار شخصیت ہیں ہمارے ''دائم جی''

دراز قد، گندمی مائل شفاف سفید رنگت، کشادہ جبین، ہلالی خم دار ابرو جن کی گھنی چھاؤں میں بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جو اپنے مالک کی علمی و عملی بلندیوں اور سرفرازیوں کی غمازی کرتی ہیں۔ سرخیوں بھرے لبوں کے مالک، افقی سلیس رخسار، چھوٹی سی نیم ستواں ناک، سیاہی مائل مرغولی بالوں اور چہرے پر داڑھی کا چراغ سجائے پر کشش شخصیت کے حامل باوقار انسان کا مکمل قلمی نام ''غلام مصطفیٰ دائمؔ اعوان'' ہے۔

احساس کی نیلی کروٹ نے مجازی تعلقات کی فرضی رسومات کو فراموش کر کے قلب کی حقیقی روشنائی سے اس وجود کو آنکھوں کے چھپے گوشوں میں چھپا کر سنہرے لمحوں میں خوب خوب دیکھا ہے۔

زبان گنگ ہوئی تو قلم نے سرِ نیاز روشنائی میں ڈبویا اور عقیدت سے بھرے ہمارے جذبات نے کچھ استعارے چنے اور دائم جی کے نام کیے:

☆شاعرہ، افسانہ نگار

چاند پر ہے سجا ہوا ہالہ　　اُجلی خندہ جبیں پہ زلفِ سیاہ
روشنی سے بھری ہوئی آنکھیں　　آگہی کا بیان ہیں باتیں
چہرہ لاجواب ایسا ہے　　خود میں وہ کائنات جیسا ہے
عالم افروز ادب کے تاروں میں　　رنگ بھرتا ہے وہ نظاروں میں

میں اور دائم جی کے سبھی عقیدت مند، دوست احباب انھیں ''غالبِ ثانی'' نہ صرف کہتے ہیں بلکہ مانتے بھی ہیں اور یہ صد فیصد حقیقت بھی ہے کہ ان کے فکر و دانش کی لہریں تہذیبی زندگی میں لب آور عملی زندگی میں اقبال سے جا ملتی ہیں۔ مجھ سے ایک صاحب نے اس بات پر کہا:
''بھلا غالب کا ثانی کون ہو سکتا ہے؟ غالب تو غالب ہے۔ کیا تم جانتی نہیں اسد اللہ خان غالب کو؟''
میں نے جواباً کہا: ''بھئی! غالب غالب ہے۔ میں کہاں انھیں کچھ کہہ رہی ہوں''
ان صاحب پر میں نے دونوں شخصیتوں کا فرق ناموں کے ساتھ دو الفاظ کے اضافے سے واضح کر دیا:
''غالب تھے، دائم ہیں! اور یہی وہ حقیقت ہے جسے رہتی دنیا تسلیم کرے گی''۔

دائم جی بس فردی شخصیت نہیں ہیں کہ انھیں کچے پیمانے سے ماپ کر ان کے کردار کے دراز قد کو گھٹنوں پہ لایا جائے۔ دائم جی ایک عہد ہیں جو علم و عمل کا ایسا ماہتاب ہیں جو اذہان میں اپنی ضیا بھرتا، قلوب میں اپنی محبت جگاتا، احساس میں اپنے وجود کی چنگاری بھڑکاتا اور نظر میں اپنی چاندنی کی کرنیں بکھیرتا ہے۔

دائم جی دنیا میں سینکڑوں ہزاروں لوگوں کے منظورِ نظر، وہ جو لکھتے ہیں مثال بن جاتا ہے، جو کہتے ہیں سرخی کا علم اور جو سوچتے ہیں فکر کی حلاوت تہذیب کی روح کو سرشار کر دیتی ہے۔ بنیادی طور پہ شاعر ہیں مگر نثر کا میدان بھی سر کر چکے ہیں۔ ایک مرتبہ کہتے ہیں:
''میں نے افسانہ صرف ذائقہ بدلنے کے لیے لکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں اچھا افسانہ لکھ سکتا ہوں کیوں کہ میں جس ادبی ماحول کا پروردہ ہوں، وہاں معاشرہ اور ادب ایک گہرے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔ افسانہ مجھے تہذیبی اقدار پہ سوچنے پہ آمادہ کرتا ہے لیکن یہ میرا اختیار کردہ میدان نہیں ہے۔ میں شاعر پیدا ہوا تھا اور شاعر ہی رہوں گا۔ کیوں کہ میں اپنی آواز اور آہنگ سے ہی اپنے اجتماعی کرب میں چنگاڑ پیدا کر سکتا ہوں''۔

لیکن میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتی بلکہ میں تو کہتی ہوں کہ ان جیسا قابل انسان جس میدان میں بھی اترے، بہت کچھ کر سکتا ہے۔ اپنی ذات کا یقین ہی کامیابی کا ضامن ہے۔ وہ اہلِ علم و ادب کا

روشن ستارہ ہیں۔ شاعری کا آغاز 2014ء میں کیا اور خود ایک جگہ مجھ سے کہنے لگے:

"میں نے پہلا کلام جب کہا تب عروض و قوافی کا نام تک نہ سنا تھا، لیکن بفضلِ خدا طبیعت کی موزونی کا کرشمہ دیکھیے کہ جب اوزان سیکھے تو معلوم ہوا کہ وہ تیرہ یا چودہ اشعار کا نعتیہ کلام مکمل باوزن تھا۔ تب وہ نعت لکھ کر ضیائے حرم مجلے میں دی، انھوں نے شائع کی۔ اس پر میں نے استاد صاحب سے سو روپیہ انعام بھی وصول کیا"۔

شروع میں اصلاح قصور سے تعلق رکھنے والے بزرگ شاعر یعقوب پرواز ؔسے لیتے رہے ہیں لیکن یہ سلسلہ سال سے آگے نہ بڑھا اور پھر خود پہ اعتماد اتنا مضبوط ہوا کہ پھر کبھی اصلاح کے لیے کلام استاد کو نہیں دکھایا۔ شاید وہ اپنے نئے طرز کے موجد بننا چاہتے تھے یا استاد کی اصلاح سے مطمئین نہیں تھے، بہر حال یہ الگ بحث ہے۔ ان کا ایک نمائندہ شعر دیکھیں:

نَفَس کی جنبشِ پیہم کوئی حیات نہیں دلیل اور کوئی زندگی کی لاؤ میاں!

دائم جی کی ترجیحات سے متعلق ایک صاحب نے ان سے سوال کیا تو کہتے ہیں:

"میری پہلی ترجیح معاشرے میں اچھا انسان بننا ہے۔ دوسری ترجیح اپنی مشرقی تہذیب میں دخیل غیر ضروری رسوم و قیود کا خاتمہ کرنا ہے"۔

بڑی ترجیحات یقیناً بڑی قربانیاں طلب کرتی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ دائم جی کسی بھی مشکل گھاڑی کو عبور کرنے کا بفضلہٖ تعالیٰ حوصلہ اور ہمت رکھتے ہیں۔ وہ قوم و ملت کے درد کو اپنے اندر بہت گہرائی تک محسوس کرتے ہیں۔ یقیناً ان کا مستقبل اور حال اپنے وطن کے ساتھ بہت مضبوط ہوگا۔

دائم جی فرصت کے لمحات بھی علمی و ادبی امور میں صرف کرتے ہیں۔ ان کے شعری اسلوب کی بات کی جائے تو وہ شعر کا مضمون ہو یا الفاظ کی تراکیب، اسلوبِ بیان ہو یا فارسی ہیئت ہر حوالے سے مشکل پسند شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ اس پر ہم دائم جی سے شکوہ کناں رہتے ہیں لیکن دائم جی کا کہنا ہے:

"گویم مشکل و گر نگویم مشکل"، یعنی میرے لیے آسان لکھنا بہت مشکل ہے۔

اب آپ اندازہ لگائیے کہ میں نے دائم جی کا لکھا ایک مضمون پڑھا جو بقول ان کے بچوں کے لیے تھا اور میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں وہ بچے تو کیا سولھویں پاس بڑوں کے بھی سر سے گزرے گا۔ اتنے دقیق الفاظ! اف!! بہت دن پہلے خود کلامی میں خود سے میں دائم جی کی شکایتیں لگا رہی تھی:

"دائم جی کو سمجھنا کوئی آسان بات ہے کیا؟ کبھی اتنا ناز خود پہ کہ سامنے والا زچ ہو جائے اور کبھی اتنی عاجزی کہ بات کرنے والا شرمندہ ہوتا رہے"۔ میں نے یہ دونوں کیفیات بہت قریب سے ان میں محسوس کی ہیں۔

ہر شخص خوبیوں اور خامیوں کے باہم ملاپ سے ہی تکمیل پاتا ہے۔اسے ان کا عیب کہیے یا خوبی، بہر حال! دائم جی بہت غصے والے ہیں۔ چھوٹی سی ناک پہ غصہ ہر دم رہتا ہے۔ جب دائم جی غصے میں ہوں تو سامنے والے کی خاموشی میں ہی اس کے لیے عافیت ہے لیکن بلاوجہ غصہ نہیں کرتے جب ان کا دیا کام مکمل نہ ہو تبھی۔ مگر دوسری طرف بہت حساس طبیعت کے مالک ہیں۔اپنے دل کی بات یونہی نہیں کہتے بلکہ اسے شاعری کے قالب میں ڈھال کر سرِ عام رکھ دیتے ہیں۔اب سمجھنے والے کی صوابدید پہ منحصر ہے، سمجھے یا نہ سمجھے۔

کھانے میں ہم پنجابیوں کی طرح ساگ، مکھن سے تیار شدہ پراٹھا، لسی اور دال چاول بہت پسند کرتے ہیں۔

دینی و عصری علوم سے مزین، خوبصورت شہر اسلام آباد کے مکین، خوشبو دار شخصیت رکھنے والے دائم جی بہت اعلیٰ انسان ہیں۔ عربی، فارسی، پہاڑی، انگریزی اور اردو کے ساتھ کئی زبانوں پر عبور رکھتے ہیں۔ یہاں کسی شخصیت سے تقابل مقصد نہیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ وہ بہت انمول ہیں۔ دائم جی کردار و افکار میں روشن ستاروں کی طرح ہیں جن کی چمک حالات کی گردش سے ماند نہیں پڑتی اور نہ ایسا ہو سکتا ہے۔

ہم سب کو دائم جی سے گلہ رہتا ہے کہ وقت نہیں دیتے اور اس پر ہم بہت ناراضی کا اظہار بھی کر جاتے ہیں لیکن ان کے پاس مضبوط جواز کی وجہ سے ہمیں چُپ سادھنے میں ہی عافیت نظر آتی ہے۔

دائم جی مطالعہ کے بہت شائق ہیں۔لگاتار نہیں لیکن دن بھر میں متفرق پانچ گھنٹے ضرور پڑھتے ہیں۔ جن میں دینی و دنیاوی دونوں طرح کی کتب شامل ہیں۔

اقبالیات میں خاصی دسترس رکھتے ہیں اور غالبیات میں گویا ڈاکٹریٹ ان کے لیے معمولی سی بات ہے۔ فلسفہ میں گہری دلچسپی، منطق میں رسوخ، سہ لسانی شعریات پہ مکمل عبور اور کسی سوال کرنے والے کو اطمینان بخش جواب دینا گویا انھی کا خاصہ ہے۔ایک صاحب نے ان سے سوال کیا کہ :

”ایک سوال ہے کہ جیسے سلیم احمد صاحب نے فرمایا تھا کہ فلسفہ کتاب سے نہیں استاد سے پڑھا جاتا ہے اب اگر بندے کو فلسفہ کا باقاعدہ استاد میسر نہ ہو تو کیا کتاب معاون ثابت ہو گی فلسفہ کی؟ کیا استاد کی راہنمائی کے بغیر کتاب دماغی انتشار کا سبب نہیں بنے گی یا پڑھ لینے میں حرج نہیں؟“

توجواباً دائم جی نے کہا: ”آپ کا سوال عموماً ذہنی فیکلٹی میں پیدا ہو جانے والے اشکالات کا ایک حصہ ہے۔ فلسفہ بنیادی طور پر اشیا کا وہ علم ہے جو وجوہ و علل پر بحث کرتے ہوئے ان اشیاء کے وجودی و تکمیلی سفر کے ہر ہر مرحلے کا براہِ راست مطالعہ و مخاطبہ ہوتا ہے۔اس لیے کتاب صرف اس سفر کے

منتہی نقطے کا نام بتا سکتی ہے جبکہ استاد انگلی پکڑ کر اس منزل تک پہنچاتا ہے۔ فلسفہ جامد ہو یا متحرک، اس سے فرق نہیں پڑتا مگر استاد چونکہ تجرباتی اور اطلاقی منطق کے دائرے میں نہیں رہتا بلکہ قیود سے نکل کر عملی فلسفے کو سمجھانے کا ہنر رکھتا ہے۔ اس لیے کتاب جامد فلسفہ سکھاتی ہے جبکہ استاد اسے متحرک کر کے عملی طور پر زندگی کے مظاہر اور فطرت کے کلیدی حوالوں میں منطبق کر کے اس کی شش جہاتی رمزیں کھول کر رکھ دیتا ہے۔ لیکن ایک اور بات یاد رہے کہ استاد کی ضرورت فلسفے کی تعلیم میں بتدریج ختم ہوتی جاتی ہے۔ کیوں کہ فلسفہ انسانی فطرت کا علم ہے جو اشیا کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت کی دریافت کرتا ہے۔ اس لیے فلسفے کے طالب علم کو ایک مقام پر پہنچ کر استاد کی ضرورت نہیں رہتی۔ ہاں! مبادیات اور کچھ اطلاقی چیزوں کی جانچ پرکھ کے لیے استاد کی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے"۔

اب اندازہ لگایئے کہ اتنا جامع اور مکمل جواب جس میں نہ تفصیلِ محض ہے نہ اجمالِ لغو، بلکہ نہایت عام اور سادہ پیرائے میں سوال کرنے والے کی تشفی کر دی۔

دائم جی جب سے میری زندگی میں آئے ہیں سب کچھ بدل سا گیا ہے۔ ان کی شخصیت ہی کا اثر ہے کہ میری علم و ادب سے جو محبت تھی اب کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ جی چاہتا ہے کچھ ایسا کچھ لکھوں جو ہمیشہ یاد رکھا جائے۔ جو موجودہ اور آنے والے سبھی لوگوں کے لیے مفید ہو۔ سادہ الفاظ میں کہوں تو مجھے اب چیزوں کی تعداد سے بڑھ کر ان کا معیاری ہونا مرغوب ہے۔ شاعری ہو یا نثر یا خود میری ذات، سب پر دائم جی کا رنگ بہت واضح نظر آتا ہے۔ شاید محبت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ محبوب کے رنگ میں خود کو رنگ دیا جائے۔

جن کی شہرت آفاقی ہوتی ہے درپردہ ان کے حاسد بھی بہت ہوتے ہیں اور مجھے اسی چیز سے ڈر لگتا ہے۔ اللہ پاک دائم جی کو حاسدوں کے حسد سے، شریروں کے شر سے ہمیشہ محفوظ رکھے۔ دنیا اور آخرت کی بھلائیاں اور کامیابیاں عطا فرمائے اور ان سے یہ عقیدتیں یونہی قائم و دائم رہیں۔ آمین!

ساتھ میرے وہ اک ستارا ہے — ماند پڑتی نہیں چمک جس کی

◈◈◈◈◈

پروفیسر احتشام حسین کا خیال ہے کہ:

"سماجی یا اخلاقی اصلاح کی پشت پناہی کے بغیر طنز طنز نہیں رہ سکتا۔ فرد کی سماجی حیثیت کو طنز کا موضوع ہونا چاہیے۔ اگر طنز میں فراخ دلی، وسیع القلبی اور انسانی ہمدردی کے عناصر نظر نہ آئیں تو طنز اعلیٰ ادب نہیں بن سکتا"

کالا رنگ (افسانہ)

شاکر حسین ☆

جھونپڑی سے بچے نے کلکاری ماری تو دائی نے بچے کو ہاتھ میں لے کر ناک منہ چڑھایا اور لاحول ولا.... پڑھا۔

جھونپڑی کے باہر میلے کچیلے پیوند لگے کپڑوں میں ملبوس راجو کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ ''یا اللہ تیرا شکر ہے''۔ راجو کے منہ سے حسب عادت نکلا۔ دائی نے پردہ ہٹا کر سر باہر نکالا اور کہا :

''مبارک راجے چاند سا بیٹا ہوا ہے''۔ دائی نے لفظِ ''چاند'' پر زور دیتے ہو کہا اور سر اندر کر لیا۔

راجو کو کچھ عجیب تو لگا مگر بیٹے کی خوشی میں سمجھ نہ سکا۔ کتنی منتوں مرادوں، دوا دارو کرتے کرتے آج شادی کے دس سال بعد یہ خوشی ملی تھی۔ وہ بھاگم بھاگ مسجد گیا اور سب سے پہلے رب سوہنے کا شکر ادا کیا کہ جو کچھ بھی ہو اللہ تیرے سوا کون ہے جو یہ خوشی دے سکتا ہے۔ شکرانے کے نفل پڑھنے کے بعد جب وہ جھونپڑی میں آیا تو آس پاس کے جھونپڑی میں رہنے والی عورتیں مبارک بادیں دینے لگیں اور مٹھائی کا مطالبہ کرنے لگیں۔

''راجے میں تو گلاب جامن کھاؤں گی''۔ ایک ادھیڑ عمر عورت نے کہا۔ ''اور میں چم چم''۔ ایک اور آواز آئی۔

''ہاں ہاں سب کو کھلاؤں گا''۔ راجہ کہتا ہوا جھونپڑی میں چلا آیا۔ جہاں اس کی بیوی حمیدہ پیلے پھٹک چہرے سے بیٹے کے حوصلے میں پڑی مسکرا ہی رہی۔

''مبارک ہو راجے''۔ حمیدہ نے کہا

''تجھے بھی مبارک ہو۔ دائی کہہ رہی تھی رنگ کا کالا ہے''۔

راجو نے سفید رنگ کے میلے سے کمبل کو ہٹا کر دیکھا تو یوں لگا کہ سیاہ شے لپٹی ہوئی آہستگی سے حرکت کر رہی ہے۔

☆ قصبہ شکار پور، ضلع راجن پور، پنجاب

''حمیدہ اللہ کا شکر کر کہ اللہ نے ہمیں یہ خوشی دی۔ چٹا کالا رنگ تو پہچان کا رنگ ہوتا ہے''۔ راجو نے حمیدہ کے ماتھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''میں اس کا نام چاند رکھوں گی!!''

''نہیں ہم اس کا نام کالا رکھیں گے''۔ راجو نے فوراً کہا۔ ''کالا بھی کوئی نام ہوا بھلا، میں تو چاند ہی رکھوں گی''۔ حمیدہ نے ضد کی۔

''اچھا اچھا رکھ لینا''۔ راجو نے کچھ سوچ کر جیسے ہتھیار ڈال دیے۔

وقت گزرتا رہا ایک سال، دو سال، تین سال.... چاند سات سال کا ہو گیا۔ اس کے کالے رنگ کی وجہ سے پاس پڑوس کی عورتیں اسے تعجب سے دیکھتیں اور اپنے بچوں کو دور رہنے کی تاکید کرتی۔ چاند اس قدر سیاہ تھا کہ رات میں اگر وہ عریانی میں باہر کھڑا ہوتا تو اس کی موتی کی طرح چمکتی آنکھیں ہی دکھائی دیتیں۔

حمیدہ نے شروع سے ہی عورتوں کے رویے کو بھانپ لیا تھا۔ اس لیے وہ چاند کو زیادہ باہر جانے ہی نہیں دیتی تھی۔ مگر کب تک جیسے جیسے اس کا قد نکلتا گیا وہ ویسے ویسے اس کی خواہشیں بڑھتی گئی۔ جب اس کی عمر بارہ سال ہوئی تو وہ بے خوفی سے باہر آنے جانے لگا۔ وہ جہاں جاتا لوگ اسے عجیب نظروں سے دیکھتے اور منہ چھپا کر ہنستے۔ بعض تو اس کو ''ابے کوے!'' اور ''بھینس کے بچے!'' یا اسی طرح کی اور سیاہ رنگ کی چیزوں سے تشبیہ دے کر بلاتے۔ چاند گھر آکر جب ماں کو بتاتا تو حمیدہ پریشان ہو جاتی اور اسے تسلیاں دیتی کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ لوگ پیار سے کہتے ہیں۔ بس تو چڑا مت کر! ورنہ لوگ اور بھی چڑائیں گے۔

مگر جب یہ معملات بڑھتے گئے تو حمیدہ راجو سے ضد کر کے دوسرے شہر آ گئے۔ مگر اچھے برے لوگ تو ہر جگہ ہی ہوتے ہیں۔

یہاں بھی یہی معاملہ چلتا رہے۔ مگر جیسے تیسے چاند سن بلوغت کو پہنچ گیا اور اب وہ لوگوں کو خوب سمجھنے لگا تھا اور اکثر خاموش رہنے لگا تھا۔

سخت جاڑے کا موسم تھا، چاند چائے پینے کے ارادے سے گھر سے نکل آیا۔ دینو کے چائے خانے پہ وہ کبھی کبھار چائے پینے آ جاتا تھا جہاں ایک بڑے سے ٹیلی ویژن میں گانے لگے ہوتے تھے۔ وہ کچھ دیر وہاں بیٹھتا اور جب لوگ اسے دیکھ کر ہنسنے لگتے تو وہ انہیں نظر انداز کرتا کرتا تھک جاتا اور چلا آتا۔ مگر آج اتوار تھا تو ٹیلی ویژن پر فلم لگی ہوئی تھی۔ جس میں ایک کردار کالے رنگ کا تھا جسے بہت مظلوم دکھایا گیا تھا اور اس سے ایک لڑکی سے محبت پر ان دونوں کی شادی کروا دی گئی تھی۔ فلم کی ہیپی اینڈنگ ہونے پر وہاں موجود لوگوں نے تالیاں بھی بجائی تھیں۔ آج عجیب بات جو ہوئی وہ یہ تھی کہ لوگ چاند کو دیکھ کر ہنسے نہیں تھے۔

چاند پر اس فلم کا بہت اثر ہوا، وہ بھی خیالوں میں ایک لڑکی سے محبت کے خواب دیکھنے لگا۔

''سارا دن گھر میں پڑے رہتے ہو کوئی کام کیوں نہیں کرتے۔ ابا کے ساتھ منڈی چلے جایا کرو''۔ حمیدہ نے چاند کو سوچوں میں گم دیکھا تو کہا۔

’’میں نہیں جاؤں گا لوگ مجھے دیکھ کر ہنستے ہیں‘‘۔ چاند نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

’’لوگوں کا کیا ہے، تو دل پہ مت لے‘‘۔

دوسرے ہی دن راجو کو منڈی جاتے ہوئے ایک لاری نے کچل دیا جو زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے چل بسا۔ گھر کی ساری ذمہ داری چاند پر آپڑی۔

’’دیکھ بیٹا! تمھارے ابا نہیں رہے۔ اب گھر کو چلانا تیرے اوپر ہے۔ میری دوائیوں کا خرچہ تو ہمارے گھر کے خرچے سے زیادہ ہے۔ ایک ماہ ہو گیا تمھارے ابا کو گئے، اب تک تو جیسے تیسے میں نے پورا کیا مگر اب تمھیں کچھ کرنا ہو گا‘‘۔ حمیدہ چاند کو قائل کر رہی تھی مگر وہ نہیں مان رہا تھا اور اپنے کالے رنگ کی وجہ سے کہیں جانے سے جھجک رہا تھا۔

’’دیکھ! تیرے ابا کا ایک منڈی کا دوست ہے مجھے بہن کہتا ہے، وہ ایک ٹھیلے کا انتظام کر دے گا اور فروٹ بھی لے دیا کرے گا بس تمھیں وہ لگا کر چوک پہ کھڑے ہو کر بیچنا ہے۔ اور میں کچھ نہیں سنوں گی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے‘‘۔ حمیدہ نے حتمی فیصلہ سنا دیا۔

چاند نے جب دیکھا کہ واقعی اب کوئی چارہ نہیں تو حامی بھر لی۔ اگلے دن چاند بھی دوسرے ٹھیلے والوں کے ساتھ چوک پر کھڑا گاہکوں کا انتظار کر رہا تھا۔ دوسرے ٹھیلے والوں نے اسے کچھ کہا تو نہیں مگر اسے دیکھ کر ہنستے اور سرگوشیاں کرنے لگتے۔ چاند کو اب تک اتنا تو تجربہ ہو گیا تھا کہ وہ کیا کہتے ہیں۔ مگر جیسے تیسے دن نکلتے رہے۔ چاند کو بھی عادت ہو گئی تھی۔ مگر جو چیز سب سے زیادہ کھل رہی تھی وہ تھی گاہک داری۔ پھل خریدنے والے چاند کے ٹھیلے پر بہت کم آتے تھے۔ ایک بار دو لڑکیاں پھل لینے آئیں تو انہوں نے چاند کی طرف غور نہیں کیا اور پھل دیکھنے لگیں مگر جیسے ہی ایک کی نظر چاند پڑی تو وہ دوسری لڑکی کو کھینچ کر ساتھ والے ٹھیلے پر جا کھڑی ہوئی۔ یہ سلسلہ شروع سے ہی چل نکلا تھا مگر نیا نیا ہونے کی وجہ سے تب محسوس نہیں ہوا۔

مگر ایک ماہ ہونے کے باوجود دھندا دن بدن مندا ہی ہوتا جا رہا تھا، گھر کا خرچا مشکل سے نکلتا تھا، ماں کی دوائیں تو کہاں آتی۔

آج صبح ہی چاند اداس تھا دوپہر ہو گئی تھی مگر ایک بھی گاہک نہیں آیا تھا۔ جو بھی آتا ریٹ پوچھتا اور چہرے کی طرف دیکھتے ہی بھاگ جاتا۔ چاند کو یہ بات بہت تنگ کرتی تھی اور دل میں اللہ سے بہت شکوے کرتا تھا۔

دن ڈھلنے میں ابھی دیر تھی کہ ایک لڑکا چاند کی طرف آیا اور کہا : ’’اوئے کالیے تیری ماں مر گئی تجھے گھر بلایا ہے‘‘۔ اس ایک جملے نے جیسے اس کے نیچے سے زمین چھین لی ہو اور آسماں سر پہ آن گرا ہو۔ وہ جیسے تیسے گھر پہنچا تو محلے کی عورتیں اس کی ماں کے گرد بیٹھیں تھیں۔ چاند کو دیکھ کر دلاسے دینے لگیں۔

چاند کی ماں کو مرے آج تیسرا روز تھا۔ تدفین کے بعد کوئی نہیں آیا تھا۔ رشتے دار تو تھے ہی نہیں ہمسایوں نے کبھی اسے منہ نہیں لگایا تھا۔ وجہ اسکا کالا رنگ تھی۔

ماں کے موت نے جیسے اس میں لاوا ابھر دیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ معاشرے سے انتقام لے کسی دشت گرد

گروہ کے ساتھ مل کر بم سے اس بستی کو اڑا دے۔ مگر سوچنے اور کرنے میں بہت فرق تھا۔
اگلے دن اپنے پاس بچے کچھ پیسوں سے پیٹرول خریدا اور اسی چوک میں آگیا جہاں وہ ٹھیلا لگاتا تھا۔ چوک کے عین وسط میں کھڑے ہو کر لوگوں کا جائزہ لینے لگا۔ آس پاس سے گزرتے لوگ اسے مضحکہ خیز انداز میں دیکھتے اور گزر جاتے۔ دوسرے ٹھیلے والے بھی دور سے اسے دیکھ کر ہنستے اور ایک دوسرے کی طرف اشارے کرتے۔ مگر آج چاند کو یہ برے نہیں لگ رہے بلکہ جو وہ کرنے آیا تھا اس کام میں تحریک دے رہے تھے۔
رش جب قدرے کم ہوا تو اس نے یک دم سے پیٹرول والا برتن اٹھایا اور اپنے اوپر الٹ دیا۔ ٹھیلے والوں کو جب تک اندازہ ہوتا کہ وہ کیا کر رہا ہے، تب تک اس نے ماچس کی تیلی کو ماچس پہ رگڑ دیا تھا۔
کچھ ہی لمحوں بعد پورا چوک دلدوز چیخوں سے گونج رہا تھا۔ جب تک آگ کو بجھایا گیا چاند کا جسم نوے فیصد جل چکا تھا۔ اس نے ایک طائرانہ نظر اپنے گرد کھڑے بے حس معاشرے کے لوگوں پہ ڈالی اور ہمیشہ کے لے آنکھیں موند لیں۔

❂❂❂❂❂

شیلی کی نظم کے قوافی / بودلیئر کے الفاظ

شیلی کی نظم (Epipsychidion) کا مسودہ اس بات کا شاہد ہے کہ وہ پہلے قافیہ لکھ لیتا تھا اور پھر اس پر مصرع بنانے کی سعی کرتا تھا۔ بودلیئر کے بارے میں Peter-Quennell نے اپنی کتاب (Baudelaire-and-the-Symbolist) میں لکھا ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے پرچے پرچیوں پر ان نئے اور دلچسپ الفاظ کو لکھ لیتا تھا جو اسے دورانِ مطالعہ نظر آتے تھے۔ اس کے پاس لکڑی کا ایک بکس تھا اور وہ ان تمام پرچوں کو اسی بکس میں محفوظ رکھتا تھا۔ جب وہ نظم کہتا تو معنیٰ خیز یا دلچسپ الفاظ کو صفحے پر جگہ جگہ لکھ کر نظم ڈھانچہ بناتا، پھر قافیے درج کرتا اور اس طرح ان کے گرد نظم کو مکمل کرتا۔

بحوالۂ شعرِ شور انگیز۔ شمس الرحمن فاروقی۔ 34/1

ڈاکٹر شہناز مزمل داخلی احساسات کی شاعرہ

ڈاکٹر شبیر ناقد

تخلیقِ شعر ایک داخلی اور وجدانی عمل ہے۔ ایسے جذبات جو خالصتاً شاعر کے دروں سے نمو پاش ہوتے ہیں داخلی احساسات کہلاتے ہیں۔ خارجی عوامل جب دروں کی دنیا پر اثر انداز ہوتے ہیں تو وہ پھر اظہار کا جامہ پہن لیتے ہیں۔ عرضِ مدعا یہ ہے کہ خارجیت بھی داخلیت پر گہرے نقوش ثبت کرتی ہے۔ یہ دونوں فکری خصائص لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں مگر پھر بھی ان دونوں کے مابین ایک تفریق ہے۔ داخلیت کا مطالعہ شخصیت کی افہام و تفہیم کے لیے ناگزیر ہے جب کہ خارجیت سماجیات کے ادراک کی مظہر ہے۔ دنیائے سخن میں دونوں کی اہمیت مسلمہ ہے۔ عموماً شاعرات کا شعری شعور داخلی افکار کا غماز ہوتا ہے جو اُن کی دروں بینی کا عکاس ہوتا ہے۔

آج ہم ڈاکٹر شہناز مزمل کے کلام کا تجزیہ داخلی احساسات کے تناظر میں کریں گے جن کا تعلق دبستانِ لاہور سے ہے۔ جن کے تادمِ تحریر پندرہ شعری مجموعے زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر دنیائے شعر و ادب سے داد و تحسین پا چکے ہیں اور ہر شعری مجموعہ اپنے اندر فکر کا ایک نیا جہان رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں سات نثری کتب بھی منصۂ شہود پر آ کر خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ شذرہ ہذا میں اُن کے آخری شعری مجموعہ ''عشق سمندر'' کے ربعِ اول کے منتخب غزلیہ اشعار کا تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ عشق بھی ایک داخلی جذبہ ہے جس کے مظاہر خارج میں بھی مشاہدہ کیے جا سکتے ہیں۔

خوف ایک داخلی کیفیت ہے جو انسان کے ظاہر و باطن پر محیط ہوتا ہے۔ اس کے گہرے تاثر کے باعث مہیب صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پھر انسان اپنے سائے سے بھی خائف نظر آتا ہے۔ راہِ عشق میں تمام عمر تلاشِ منزلِ جاناں میں گزرتی ہے اور قرب کا ایک لمحہ اُسے پایۂ تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ جب انسان خواہشوں کا غلام بن جائے تو حسرتوں کے باب وا ہو جاتے ہیں۔ پھر تمناؤں کی دنیا پر حزن و ملال ہو جاتی ہے۔ یہ سب معاملات ذات سے علاقہ رکھتے ہیں اور ذات ہی دروں کا مستقل اور معتبر حوالہ ہے۔ اسی نسبت سے اُن کی غزل کے تین اشعار زیبِ قرطاس ہیں۔

خوف انجانا رگ و پے میں سرایت کر گیا   اور پھر انسان اپنے سائے سے خود ڈر گیا
مدتوں سے میں بھٹکتی تھی تلاشِ یار میں   عشق کو میرے مکمل ایک لمحہ کر گیا
ہر کوئی شہناز آپنی خواہشوں کا ہے غلام   منظرِ شہرِ تمناسب کو پرنم کر گیا

جب زندگی کے مصائب و آلام دروں کی دنیا پر اثرانداز ہوتے ہیں تو پھر انسان سنسار کو تنقیدی نگاہ سے دیکھتا ہے اور شکوہ سنج نظر آتا ہے۔ تخلیقِ کائنات کی حقیقت مذموم نظر آتی ہے۔ لیکن زیست کی مسافت میں عشق ایک مینارِ نور ثابت ہوتا ہے۔ اگر اس کی راہنمائی شاملِ حال نہ ہو تو انسان گردِ راہ بن جاتا ہے۔ ہر جگہ محبوبِ حقیقی کی جلوہ سامانیاں نظر آتی ہیں۔ جیسے خواجہ میر درد ؔنے کہا تھا:

جگ میں آ کر ادھر اُدھر دیکھا   تو ہی آیا نظر، جدھر دیکھا

انہیں افکار سے متصف اُن کی غزل کے تین اشعار آپ کے ذوقِ طبع کی نذر ہیں:

زندگی کربِ مسلسل اک مسلسل امتحاں   کیا اسی کے واسطے تو نے بنایا یہ جہاں
عشق نے کی راہنمائی یہ بہت اچھا ہوا   جانے کس رستے پہ لے جاتا غبارِ کارواں؟
کیا کوئی ایسی جگہ بھی ہے جہاں پر تو نہ ہو؟   کس لیے پردہ ہے حائل تیرے میرے

ذات سے انحراف فطری حقائق سے روگردانی کے مصداق ہے جس نے اپنے آپ کو نہیں پہچانا اُس نے اپنے رب کو نہیں پہچانا اس لیے عرفانِ ذات ناگزیر ہے اس لیے انسان تمام عمر اپنی ذات کی تلاش میں رہتا ہے ذات کی بازیافت عرفان و آگہی کی منزل ہے ہم دنیاداری کے جھمیلوں میں اتنا کھو جاتے ہیں اور ہمیں خود سے محبت نہیں رہتی بقول راقم الحروف:

مجھے خود سے ملنے کی فرصت نہیں ہے   حقیقت میں خود سے محبت نہیں ہے

دور بدلتا ہے، اس کے تقاضے بدلتے ہیں۔ اگر تغیرِ حال کے اثرات ہم پر مرتب نہیں ہوتے تو ہم خود کو اجنبی محسوس کرتے ہیں اور یہ اجنبیت بیگانگی کی علامت ہے۔ راہِ عشق میں انسان تمام مصائب و آلام سے آشنا ہو جاتا ہے۔ حقیقت کا عرفان ہی سرچشمۂ آگہی ہے۔ ان افکار کی جھلک اُن کی غزل کے تین اشعار میں دیکھتے ہیں:

جب کہ خود سے بچھڑ گئے ہیں ہم   کس لیے خود کو ڈھونڈتے ہیں ہم؟
لوگ بدلے تو ایسا لگتا ہے   اپنے ہی شہر میں نئے ہیں ہم
عشق منزل کے ہم مسافر ہیں   سب مصائب کو جانتے ہیں ہم

ڈاکٹر شہناز مزمل معرفت کی شاعرہ ہیں۔ اُن کا عشق حقیقی نوعیت کا ہے۔ اس لیے تمام موجودات میں اُسے خالقِ کائنات کی ذات دکھائی دیتی ہے۔ تمام سنسار اُسی کا پرتو نظر آتا ہے۔ قلب و زبان پر اُسی کے ہی ترانے ہیں۔ وہ شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ اُس کی دوری بعید از بصارت ہے۔ اسی حوالے سے اُن کی غزل کا ایک

شعر دنیائے شعر کے متوالوں کی نذر ہے:

موسم بدلے رُت بدلی ہے منظر بدلے ہر شے میں بس اُس کی ذات دکھائی دے

وہ عشقیہ کیفیات و واردات کو رقم کرنے میں یدِ طولیٰ رکھتی ہیں۔ رومانی جذبات و احساسات اُن کے کلام میں بھرپور انداز میں جلوہ نما ہیں۔ کسی بھی صورت حال کی ترجمانی احسن اور مؤثر طریقے سے کرنا اُن کے شعری شعور کا حصہ ہے۔ ایک ہی مصرع کے پیمانے میں کئی تلازمے پائے جاتے ہیں جو اُن کی کمالِ فن کاری کی دلیل ہے۔ طویل المیعاد شعری ریاضت کی بدولت اُن کا فن کہنہ مشقی کا مظہر ہے۔ اسی تناظر میں اُن کی غزل کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

تم عشق ہو نشہ ہو مئے ناب ہو کیا ہو؟ چڑھ جائے جو سر پر تو اُترتا ہی نہیں ہے

عشق کی بدولت انسان سوز و گداز کا شناور بن جاتا ہے۔ سوزِ ہجراں کے باعث مسلسل اضطراب کا عمل جاری و ساری رہتا ہے۔ یہ حزن و ملال لازوال اور دائمی ہوتا ہے یہ بے تابی بھرپورے ماحول کا حصہ دکھائی دیتی ہے۔ اسی نسبت سے ان کی غزل کا ایک شعر آپ کی ضیافتِ طبع کے لیے پیش کرتے ہیں:

دور تک درد کا جلتا ہوا صحرا دیکھا سینے میں جو بھڑکی تو بھڑکتی ہی گئی

اُن کے داخلی احساسات گہرائی و گیرائی کے حامل ہیں جس سے اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ داخلیت پر بھرپور دستگاہ رکھتی ہیں۔ جب انسان کو چار سو خوف کے سائے مہیب نظر آئیں تو وہ اپنی ذات کے اندر پناہ لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ بقول ڈاکٹر شہناز مزمل:

کیا کریں گردشِ حالات سے ڈر لگتا ہے اپنے اندر کی ہی دنیا میں بسا کرتے ہیں

مذکورہ شواہد شاہد ہیں کہ ڈاکٹر شہناز مزمل کے ہاں داخلی افکار وفور سے ملتے ہیں۔ اُن کا شمار اُن شاعرات میں ہوتا ہے جن کے حوالے سے ناقدینِ فن کے مابین ایک معتبر رائے ملتی ہے۔ اگر اُن کا شعری سفر تسلسل سے جاری و ساری رہا تو اُن کے فکر و فن میں مزید بالیدگی آشکار ہو گی۔

◇◇◇◇◇

معنیٰ آفرینی اور مضمون آفرینی الگ الگ چیزیں ہیں۔ مضمون آفرینی سے مراد ہے (1) کوئی نیا مضمون پیدا کرنا (2) کسی پرانے مضمون سے کوئی نیا پہلو نکالنا (3) کسی پرانے مضمون کو نئے ڈھنگ سے بیان کرنا۔ اور معنیٰ آفرینی سے مراد ہے (1) کسی شے یا حقیقت میں نئے معنیٰ دریافت کرنا (2) کلام کے معنیٰ بظاہر کچھ ہوں لیکن غور کریں تو کچھ اور معنیٰ نکلیں (3) کلام کے ایک معنیٰ ظاہر ہوں لیکن غور کریں تو اس میں متعدد معنیٰ ہیں (4) کلام ظاہر اور بیّن طور پر کثیر المعنیٰ ہو (5) کلام میں ایسی رعایتیں ہوں، جن سے نئے معنیٰ کا قرینہ نکلے۔ (بحوالہ شعرِ شور انگیز۔ شمس الرحمن فاروقی۔ 347/1)

(افسانہ؛تعریف اور خصوصیت)

افسانے کی تعریف: ’’زندگی کے کسی ایک پہلو، ایک واقعہ ایک جذبہ، ایک احساس، ایک خیال، ایک تاثر ،ایک مقصد یا ایک ذہنی کیفیت کو ایجاز واختصار کے ساتھ کہانی کی شکل میں اس خلاقانہ اور فنی طریقے سے بیان کرنا کہ اس میں اتحاد تاثر پیدا ہو جائے جو پڑھنے والے کے جذبات واحساسات پر اثر انداز ہو، افسانہ کہلاتا ہے‘‘ پروفیسر وقار عظیم لکھتے ہیں کہ: ’’مختصر افسانہ ایک ایسی فکری داستان ہوتی ہے جس میں ایک خاص کردار، کسی ایک خاص واقعہ پر روشنی ڈالی گئی ہو۔اس میں پلاٹ (ماجرا) ہو اور اس پلاٹ کے واقعات کی تفصیلیں اس طرح گھٹی ہوئی اور اس کا بیان اس قدر منظم ہو کہ وہ ایک متحد اثر پیدا کر سکے‘‘[بحوالہ: فن افسانہ نگاری،صفحہ 08،اردو مرکز لاہور] اس تعریف میں لفظ ’’مختصر‘‘ پر ذرا روشنی ڈالی جائے تو مناسب ہوگا۔بنیادی سبب یہ ہے کہ اس سے ناول اور افسانہ میں فرق واضح ہو لیکن اہم وجہ یہ ہے کہ اس سے تاثر کی وحدت قائم رہے اور داستان میں زندگی کے کئی پہلوؤں سے احتراز برت کر ایک ہی پہلو پر تفکرانہ تبصرہ کیا جائے۔لیکن اس لفظ ’’مختصر‘‘ سے ایک سوال یہ بھی ابھرتا ہے کہ اس اختصار سے کیا مراد ہے؟ اور اس کے لیے مخصوص وقت کا تعین ہے کہ نہیں؟ ایڈگر ایلن پو (Edgar Allen Poe) کا شمار اولین لکھنے والوں میں ہوتا ہے، افسانے کے لیے وقفے کا تعین کرتے ہوئے لکھتا ہے: Requiring.A short-story is a prose narrative:
Selection].fron half an hour to one or two hours in its perusal
[958# Page,from the Critically Writing] ایڈگر ایلن پو نے وقت کی قید لگاتے ہوئے یہ شرط بھی عائد کر دی کہ اسے ایک نشست میں پڑھا جانا چاہیے۔اگر ایک نشست میں نہ پڑھی جاسکے تو وہ اپنا تاثر زائل کر دیتی ہے۔افسانے میں وقت کی ضرورت اس لیے محسوس کی گئی تاکہ وحدتِ تاثر [اس پہ تفصیلی گفتگو اگلے اسباق میں آئے گی] برقرار رہے اور ایک ہی نشست میں کہانی کو پڑھا جاسکے۔البتہ بعض نقادوں کی نگاہ میں اختصار کے بارے میں غیر ضروری حساس ہونے کے باعث افسانہ نگار مشکلات کا شکار ہو سکتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی لفظ یا صفحے گن کر کہانی لکھی جائے۔شاید اسی لیے ڈاکٹر انور سدید نے ’’مختصر‘‘ کے لفظ پر انوکھا اعتراض کیا ہے: ’’افسانے کے ساتھ ’’مختصر‘‘ کے سابقے نے ایک غیر معقول صورت کو جنم دیا اور وہ یہ کہ اس صنف کی جتنی بھی تعریفیں انیسویں صدی میں وضع کی گئیں، ان میں بیشتر مطالعے کے لیے وقت کی طوالت اور مستعمل الفاظ کی تعداد کو نسبتاً زیادہ اہمیت دی گئی‘‘[مختصر افسانہ،عہد بہ عہد-صفحہ 10 ،مقبول اکیڈمی لاہور] ڈاکٹر فوزیہ اسلم اس اقتباس کو نقل کر کے لکھتی ہیں کہ: ’’ڈاکٹر انور سدید کے اس اعتراض کے باوجود یہ بات طے ہے کہ افسانے کی شناخت اختصار ہی کے ساتھ ہے۔اس لیے بھی کہ اس میں ناول کی طرح تمام تر زندگی کا احاطہ نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے کسی ایک پہلو یا کسی کردار کی کوئی بنیادی خصوصیت یا پھر کسی موضوع کی بنیادی اہمیت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی جاتی ہے‘‘[اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات- صفحہ 05،نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد]